ماہنامہ حکمتِ قرآن لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

مرکزی **انجمن خُدّامُ القُرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان ـــــ اور ـــــ **سرچشمۂ یقین**

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے ـــــ اور ـــــ اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ ـــ اور ـــ **غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی**

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا

ماہنامہ حکمت قرآن لاہور

جاری کردہ

ڈاکٹر محمد رفیع الدین، ایم - اے - پی - ایچ - ڈی - ڈی لٹ (مرحوم)

جمادی الثانی ۱۴۰۴ھ

بمطابق

مارچ ۱۹۸۴ء

جلد ۳ شمارہ ۱

مدیر اعزازی

ڈاکٹر ابصار احمد

ایم اے۔ ایم فل۔ پی ایچ ڈی

معاون مدیر

حافظ عاکف سعید

ایم اے فلسفہ

فہرس

حرفِ اوّل ——— ۴
[illegible]

الٓمٓ (سورۃ طٰہٰ ——— ۵
[illegible]

قرآن مجید قرآن مجید کی روشنی میں ۱۷

انسانی تعلیم و تربیت کے قرآنی مقاصد ۳۶
ڈاکٹر مسیم فاروقی

سائنس کا روحانی پہلو قرآن حکیم کی روشنی میں ۴۵
چوہدری مظفر حسین

مروّجہ نظام زمینداری اور اسلام ۴۹
مولانا محمد طاسین

توضیح اشکالات ——— ۵۹
مولانا محمد طاسین

افکار و آراء ——— ۷۱

یکے از مطبوعات: مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور - ۳۶ - کے ماڈل ٹاؤن، لاہور

مطبع آفتاب عالم پریس - زرِ سالانہ: -/۲۰ روپے اس شمارہ کی قیمت -/۲ روپے

مطالعہ فطرت اور ایمان

ایک صاحبِ خیر کی فکر انگیز تحریر

شائع شدہ 'حکمتِ قرآن' مارچ، اپریل ۸۳ء

ڈاکٹر اسرار احمد

کی نظرِ ثانی کے بعد کتابی صورت میں شائع ہو گئی ہے

اور مندرجہ ذیل پتوں سے "ھدیۃً" طلب کی جا سکتی ہے

۱۔ مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۳۶۔ کے، ماڈل ٹاؤن، لاہور ۱۴

۲۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۳۵۸۸ کراچی نمبر ۲

ڈاکٹر ابصار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ اوّل

الحمدللہ اس شمارے سے "حکمتِ قرآن" تیسرے سال میں قدم رکھ رہا ہے۔ برادرم محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ نے جب اس موقر ماہنامہ کی ادارت راقم کے سپرد کی تھی تو مجھے شدّت کے ساتھ اس کا اندیشہ تھا کہ میں اس ذمہ داری کو کما حقہ نبھا نہ سکوں گا چونکہ میں اس کوچہ سے ناواقف محض تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کا صد شکر و احسان ہے کہ اس نے اپنے فضلِ خاص سے میری نصرت فرمائی اور پرچہ نہ صرف باقاعدگی سے شائع ہوتا رہا بلکہ اس نے قبول عام بھی حاصل کیا۔ فللہ الحمد والمنۃ۔

چودھویں صدی ہجری کی تین نابغہ روزگار شخصیتوں کی اُمّتِ مسلمہ کے موجودہ انحطاط، زوال اور نکبت و فلاکت کے متعلق تشخیص۔ اس کا تارکِ قرآن ہونا ہے۔ پھر ان تینوں نے اس کا علاج اعتصام بالقرآن تجویز کیا تھا۔ عجیب اتفاق ہے کہ یہ تینوں نابغہ روزگار ہستیاں مختلف کوچوں سے متعلق تھیں، تینوں نے علیحدہ علیحدہ ماحول میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔

ان میں سے ایک شخصیت مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم کی ہے جنہوں نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ نہایت زوردار اور مؤثر انداز میں مسلمانانِ برصغیر کو رجوع الی القرآن کی دعوت دی۔ مولانا نہ کسی یونیورسٹی کے فارغ التحصیل تھے نہ کسی دینی دارالعلوم کے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو خصوصی طور پر بلند پایہ ذہانت و فطانت سے نوازا تھا۔ مولانا آزاد مرحوم کو اس دنیا میں اس سے بڑی تحسین نہیں مل سکتی تھی کہ ان کے بارے میں شیخ الشیوخ استاذ الاساتذہ، شیخ الہند مولانا

محمود حسن دیوبندیؒ نے فرمایا" اس نوجوان نے ہمیں ہمارا بھولا ہوا سبق یاد دلایا"۔ نیز مولانا آزاد مرحوم کے لئے اُس سے بڑا کوئی اعزاز نہیں ہوسکتا تھا کہ شیخ الہندؒ کے ایما پر ۱۹۲۰ء میں جمیعت العلماء ہند کے سالانہ اجلاس میں ان کو امام الہند قرار دے کر ان کے ہاتھ پر بیعتِ جہاد کی تجویز پیش کی گئی ـــ مولانا آزاد کے یہ الفاظ آبِ زر سے لکھنے کے قابل ہیں :۔

" اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علتِ حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگادے کہ صرف ایک ہی علت اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل و اسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جاسکتا ہے کہ علماءِ حق مُرشدین صادقین کا فقدان اور علماء سوء و مفسدین دجالین کی کثرت ـــ رَبَّنَا اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَنَا فَاَضَلُّوْنَا السَّبِيْلَا ۔

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیئے کہ " لا یصلح آخر ھذہ الامۃ الا بما صلح بہ اولھا" یعنی اُمتِ مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہوسکے گی، تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے صلاح پائی تھی اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی و حقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں ۔

ان میں سے دوسری شخصیت خود شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندی رحمہ اللہ کی ہے جن کی ساری عمر قال اللہ و قال الرسول میں گذری ۔ ۱۹۲۰ء کے اوائل میں اسارت مالٹا سے واپسی کے بعد دیوبند میں اساتذہ و علماء کے ایک اجتماع میں شیخ الہند نے فرمایا :۔

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے، ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لئے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے۔ بچوں کے لئے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کئے جائیں۔ بڑوں کو عوامی درس قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لئے آمادہ کیا جائے اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔

ان میں سے تیسری شخصیت علامہ ڈاکٹر اقبال مرحوم و مغفور کی ہے جنہوں نے وقت کی جدید اعلیٰ یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی تھی اور قدیم و جدید فلسفوں کو گھنگالا تھا۔ ساتھ ہی قرآن مجید کا معروضی مطالعہ کیا تھا پھر وہ جس نتیجہ پر پہنچے وہ ان کی فارسی و اُردو شاعری میں رچا بسا ہے۔ صرف ایک رباعی پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

خوار از مہجوریٔ قرآن شدی
شکوہ سنج گردش دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمین افتندۂ
در بغل داری کتاب زندۂ

برادرم محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ بھی اپنے ذاتی مطالعہ اور غور و فکر سے اسی تشخیص و تجویز پر پہنچے جس پر یہ تین نابغہ روزگار حضرات پہنچے تھے۔ موصوف نے اس کے مطابق ۱۹۶۸ء سے عملاً ایک تحریک کی شکل میں کام بھی شروع کر دیا۔ قریباً پانچ سال تک وہ تن تنہا یہ کام کرتے رہے حتیٰ کہ بفضلِ ایزدی وہ مرحلہ بھی آگیا کہ ؎

؎ گئے دن کہ تنہا تھا میں انجمن میں یہاں اب مرے رازداں اور بھی ہیں

اور ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ جس نے اپنے وسائل کے مطابق دعوتِ رجوع الی القرآن کو ایک تحریک کی شکل میں آگے بڑھایا۔ یہ توفیق الٰہی سے انجمن کے قیام اور عملاً خدمتِ دعوتِ قرآن کا یہ ثمرہ ہے کہ نہ صرف پاکستان بلکہ بیرونی ممالک میں بھی قرآن مجید کی طرف معروضی طور پر ہمارے اہل علم و دانش کا رجوع روز افزوں ہے اس کتابِ مبین کی طرف التفات میں اضافہ ہو رہا ہے۔

قرآن مجید کا تاکیدی حکم ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ حقیقت نفس الامری یہ ہے کہ تجدید دین اور اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے اساسی و بنیادی اہمیت اسی کتابِ الٰہی کو حاصل ہے۔ اعتصام بکتاب اللہ ہی واحد وہ نقطہ ماسکہ ہے جو اُمّت میں وحدت پیدا کر سکتا ہے اسی مقصد کے لئے انجمن کے زیر اہتمام ابتدائی پانچ سالوں میں قرآن کانفرنسوں کا انعقاد ہوتا رہا اور اب چار سال سے محاضراتِ قرآنی کا انعقاد ہو رہا ہے۔ ۱۹۸۳ء میں ان کا انعقاد دو مرتبہ ہوا۔ اب ۲۵ مارچ ۸۴ء سے ۲۸ مارچ ۸۴ء تک بعد نمازِ مغرب پانچویں بار جناح ہال لاہور میں محاضرات قرآنی منعقد ہوں گے۔ جس میں ان شاء اللہ پاکستان کے اصحاب علم و دانش کے علاوہ بھارت سے بھی بعض علمائے کرام شرکت فرمائیں گے جن میں اہم ترین شخصیت مولانا سعید احمد صاحب مدظلہ اعلیٰ مدیر ماہنامہ برہان دہلی اور ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی دیوبند کی شرکت یقینی ہے الّا یہ کہ قدرت ہی کو منظور نہ ہو۔ مولانا موصوف ان شاء اللہ ان محاضرات میں "قرآن کی دعوت" پر چار لیکچرز دیں گے۔

ان "قرآنی کانفرنسوں اور محاضرات کے انعقاد کا مقصد وحید یہ ہے کہ مختلف فقہی مکاتیب فکر کے اہل علم اور اہلِ دانش و بینش ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر قرآن حکیم کے عرفان و معارف کو معروضی طور پر نئی نسل تک

پہنچائیں تاکہ بقول علامہ اقبال ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است   پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است
ما ہمہ خاک و دل آگاہ اوست   اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست

اور از روئے قرآن حکیم، قرآن کے ذریعہ تجدید و احیائے دین کی منزل قریب آسکے : اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ

اور بموجب ارشادِ نبوی : ان اللہ یرفع بهٰذا الکتٰب اقواما ویضع به اٰخرین -

واٰخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ہ

قارئین متوجہ ہوں!

ماہنامہ حکمتِ قرآن کا سالانہ زرِ تعاون اندرونِ ملک -/۳۰ روپے ہے جبکہ دوسرے ممالک کے لئے زرِ تعاون حسبِ ذیل ہے :

کینیڈا -/۱۵۰ روپے یا ۱۵ کینیڈین ڈالر

امریکہ، افریقہ، مغربی جرمنی، نائیجیریا -/۱۵۰ روپے یا ۱۲ امریکن ڈالر

انگلینڈ، ناروے، متحدہ عرب امارات -/۱۰۰ روپے

سعودی عرب، ابوظہبی، مصر، ایران -/۶۰ روپے

انڈیا -/۸۰ روپے

پاکستان کے دیگر شہر جہاں تنظیم کی ذیلی شاخیں قائم ہیں وہاں میثاق درج ذیل پتوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

★ پشاور : دفتر تنظیم اسلامی۔ نثار بلڈنگ پل پختہ نزد چوک یادگار، پشاور

★ ملتان : عبدالغنی صاحب، ملتان پولٹری کارنر۔ بالمقابل فاطمہ جناح ہسپتال، ملتان۔ فون ۷۵۸۹۱

★ کوئٹہ : دفتر تنظیم اسلامی جناح روڈ کوئٹہ اور قاری افتخار احمد صاحب خطیب مسجد طوبیٰ۔ مسجد روڈ کوئٹہ۔ فون ۷۷۲۹۵

★ کراچی : داؤد منزل۔ نزد آرام باغ۔ شاہراہ لیاقت کراچی۔ فون ۲۱۴۷۰۹

★ راولپنڈی : وزی لینڈ اسکول ۱-8-۱۴۰ - راولپنڈی سٹلائٹ ٹاؤن فون ۴۳۷۳۶

★ گوجرانوالہ : جناب پاشا ہارون برکی ، بی - ۵۸۱ - سٹلائیٹ ٹاؤن

★ سیالکوٹ : جناب محمد منیر اقبال، معرفت وحید کلینک چوک کوٹلی بہرام فون ۳۴۲۴

★ وہاڑی : ڈاکٹر منظور حسین منظور محمدی ہسپتال - X-۱۷ - بیپلز کالونی

تصانیف : ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

١	اسلام کی نشأۃ ثانیہ، کرنے کا اصل کام		١/٥٠
٢	مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق	ادنیٰ / اعلیٰ	٣/- / ٤/-
٣	راہِ نجات، سورۃ والعصر کی روشنی میں	مفصل / مختصر	٣/- / ٢/-
٤	دعوت الی اللہ		١/٥٠
٥	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت	ادنیٰ / اعلیٰ	٣/- / ٤/-
٦	نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ہمارے تعلق کی بنیادیں	ادنیٰ / اعلیٰ	٢/- / ٣/-
٧	قرآن اور امنِ عالم		١/٥٠
٨	علامہ اقبال اور ہم		٢/-
٩	عظمتِ صوم		١/٥٠
١٠	قرآن حکیم کی سورتوں کے مضامین کا اجمالی تجزیہ		١٠/-
١١	مطالعۂ قرآن حکیم کا منتخب نصاب		١٠/-
١٢	عید الاضحیٰ اور فلسفۂ قربانی		٣/-
١٣	سرافگندیم		٧/-
١٤	مطالباتِ دین		٨/-
١٥	تحریکِ جماعت اسلامی	ادنیٰ / اعلیٰ	١٠ / ٢٠
١٦	شہیدِ مظلوم	ادنیٰ / اعلیٰ	٣/ / ٤/
١٧	اسلام اور پاکستان		٥/-
١٨	تنظیمِ اسلامی کی دعوت		٤/-
١٩	سانحۂ کربلا		٣/-
٢٠	رسولِ کامل صلی اللہ علیہ وسلم		٦/-
٢١	مسلمانوں کے فرائض دینی اور اسوۂ رسول ﷺ		٦/-

عربی ترجمہ :

٢٢	ماذا یجب علی المسلمین تجاہ القرآن ؟	٥/-

فارسی ترجمہ :

٢٣	دین قرآن بگردن مسلمان	زیر طبع

انگریزی تراجم :

٢٤	The Obligations Muslims owe to the Quran.	٥/-
٢٥	The way to Salvation—in the light of Surah Al-'Asr.	٥/-
٢٦	Islamic Renaissance—The Real Task Ahead.	٤/-
٢٧	The Quran & World Peace.	٤/-
٢٨	Rise & Decline of Muslim Ummah.	٥/-

سلسلۂ تقاریر الٓمٓ

سُورۂ طٰہٰ

مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد

السلام علیکم! نحمدہ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، اما بعد
اعوذ باللہ من الشیطٰن الرجیم بسم اللہ الرحمٰن الرحیم
طٰہٰ ۝ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَیْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ۝ اِلَّا تَذْكِرَةً
لِّمَنْ یَّخْشٰى ۝ تَنْزِیْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَالسَّمٰوٰتِ
الْعُلٰى ۝ اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ
وَمَا فِی الْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا وَمَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝
آمنت باللہ وصدق اللہ العظیم

قرآن حکیم کی جو سورتیں دو دو حروف مقطعات سے شروع ہوتی ہیں ان میں سے ایک سورۃ طٰہٰ بھی ہے۔ یہ سورہ مبارکہ مصحف میں سولہویں پارے میں پورے نصف کے آخر میں پھیلی ہوئی ہے۔ اسکی ۱۳۵ آیات ہیں۔ جن میں سے تقریباً ۹۰ آیات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات وکوائف پر مشتمل ہیں۔ اور یہ سورہ ۸ رکوعوں میں منقسم ہے۔

حروف مقطعات طٰہٰ کے بارے میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی رائے یہ ہے کہ اس کے معنی ہیں "یا رجل" اور اس سے مراد ہے "یا محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم"، گویا کہ یہاں بھی وہی بات ہے جو سورہ یٰسٓ میں ہے۔ اور جیسا معنوی ربط وہاں موجود ہے، ویسا ہی یہاں بھی ہے۔ اس لئے کہ حروف مقطعات کے فوراً بعد حضورؐ سے خطاب شروع

ہو جاتا ہے۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى

"اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہم نے یہ قرآن آپ پر اسلئے نازل نہیں فرمایا کہ آپ مصیبت میں مبتلا ہو جائیں یا آپ ناکام ہوں۔"

جہاں تک حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و کوائف کا تعلق ہے تو وہ اس سورہ مبارکہ کے تقریباً دو تہائی حصے پر پھیلے ہوئے ہیں۔ اور سب سے زیادہ تفصیل کے ساتھ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات اسی سورہ مبارکہ میں بیان ہوئے ہیں۔ ان حالات و کوائف کے ضمن میں جو پہلی وحی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر کوہ طور پر ہوئی تھی جبکہ انہیں نبوت اور رسالت سے سرفراز فرمایا گیا تھا اس کا بھی اس سورہ مبارکہ میں قدرے تفصیل سے ذکر ہے۔ ساتھ ہی اس موقع پر نہایت مختصر لیکن جامع ترین الفاظ میں، دین کے جو اساسی معتقدات ہیں، بنیادی ایمانیات ہیں ان کو چند الفاظ میں سمو دیا گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مخاطبے کے موقع پر فرمایا گیا:

اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا تَسْعٰى ۝ (آیات ۱۴ - ۱۵)

"(اے موسیٰ!) میں اللہ ہوں، میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے پس میری ہی بندگی کو لازم پکڑو۔ اور میری یاد کیلئے نماز کو قائم رکھو، اور جان لو کہ قیامت آکر رہے گی۔ میں نے اس کو مخفی رکھا ہے تاکہ ہر ذی نفس کو اس کے کئے کا پورا پورا بدلہ مل جائے۔"

ذرا آگے چل کر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا جاتا ہے،

اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی ۝ (آیت ۲۴)

"فرعون کے پاس جاؤ وہ بہت سرکش ہو گیا ہے۔" اس طرح حضرت موسیٰؑ کی بعثت کا دوسرا پہلو سامنے آتا ہے۔ لہٰذا یہ دوہری رسالت کا جو بار گراں آپ جنابؑ کے کندھوں پر آیا، اس سے آں جناب کے جو احساسات سامنے آتے ہیں، وہ بڑے ہی پیارے الفاظ میں اس دعا کی صورت میں بیان ہوئے ہیں کہ جو فوراً حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمائی:

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِیْ صَدْرِیْ ۝ وَیَسِّرْ لِیْٓ اَمْرِیْ ۝ وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِیْ ۝ یَفْقَهُوْا قَوْلِیْ ۝ وَاجْعَلْ لِّیْ وَزِیْرًا مِّنْ اَهْلِیْ ۝ هٰرُوْنَ اَخِیْ ۝ اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِیْ ۝ وَاَشْرِكْهُ فِیْٓ اَمْرِیْ ۝ كَیْ نُسَبِّحَكَ ۝ كَثِیْرًا ۝ وَّنَذْكُرَكَ كَثِیْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِیْرًا ۝

(آیات ۲۵ تا ۳۵)

"پروردگار میرے سینے کو کھول دے میری زبان کی گرہ جو ہے اسے وا فرمادے۔ میرے لئے اس کام کو آسان فرمادے۔ کہ جو آج میرے حوالے کیا جا رہا ہے اور پھر مجھے وہ اندازِ تکلم عطا فرما جس کو لوگ اچھی طرح سمجھ پائیں۔ اور میرے بھائی کو میرے ساتھ اس کام میں شریک فرما کر اسکو میرے لئے بطور معاون میرا نائب بنادے۔ تاکہ ہم دونوں مل جل کر ان فرائض رسالت کو بہتر طور پر سرانجام دے سکیں اور تیری تسبیح اور تقدیس بہتر طور پر کر سکیں۔"

اللہ تعالےٰ نے حضرت موسیٰؑ کی یہ درخواست منظور فرمائی اور حضرت ہارونؑ کو بھی نبوت و رسالت سے سرفراز فرمانے کے فیصلہ سے حضرت

موسیٰؑ کو مطلع فرماتے ہوئے دعوت و تبلیغ کے طریقے اور نہج کے لئے اصولی ہدایت بھی مرحمت فرمادی - یہ وہ ہدایت ہے کہ جو ابدالآباد تک دینِ حق کی دعوت و تبلیغ کے لئے رہنما اصول کا مقام رکھتی ہے فرمایا:

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝ (آیت ۴۳-۴۴)

"اللہ تعالےٰ نے فرمایا اے موسیٰ! تم اور تمہارا بھائی دونوں فرعون کی طرف جاؤ - وہ بہت سرکش، نافرمان اور طاغی و باغی ہوگیا ہے - اس نے اپنی خدائی کا تخت بچھا لیا ہے وہ لوگوں سے اپنی پرستش کراتا ہے - خدائی اختیارات کا دعویدار اور مدّعی ہے - اس کو حق کی دعوت دو - توحید کا پیغام دو - ہمارے پیغام کی اس پر تبلیغ کرو لیکن دیکھنا اس سے نرمی کے ساتھ بات کرنا - اُسے ہمدردی اور دل سوزی کے ساتھ حق کی طرف دعوت دینا - ترش روئی اور سخت کلامی سے اجتناب کرنا ہوسکتا ہے کہ وہ یاد دہانی و نصیحت قبول کرلے اور اس کے دل میں اپنے حقیقی خالق اور ربّ کا خوف پیدا ہوجائے -"

یہ وہ ہدایت ہے جو حضرت موسیٰ جیسے جلیل القدر پیغمبر کو دی گئی - اس ہدایت کو خاص طور پر ان تمام حضرات کو رہنما اصول کے طور پر سامنے رکھنا چاہیئے جو دینِ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے فرضِ منصبی کی ادائیگی کے اعلیٰ و ارفع کام میں اپنی توانائیاں لگا رہے ہوں -

آگے چل کر اسی سورہ مبارکہ میں ایک اور اہم مضمون بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات کے ضمن میں آیا ہے کہ جب آنجناب کو دوسری بار کوہ طور پر طلب فرمایا گیا، جب کہ تورات آپ کو عطا ہوئی تھی - اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالےٰ سے ملاقات کے اشتیاق میں وقت معین سے پہلے پہنچ گئے - اپنی قوم کو چھوڑ

کر جلدی فرما کر کوہ طور پر حاضر ہو گئے - وہاں اللہ تعالےٰ نے سوال کیا

وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ○ (آیت ۸۳)

"اے موسیٰ! وہ کونسی چیز ہے جس نے تمہیں اتنی جلدی پر آمادہ کیا کہ تم اپنی قوم کو پیچھے چھوڑ کر یہاں وقت سے پہلے پہنچ گئے"

جواب ملاحظہ ہو حضرت موسیٰ بارگاہ خداوندی میں عرض کرتے ہیں -

وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ○ (۸۴)

"پروردگار میں جلدی کر کے اسلئے آیا کہ تو راضی ہو جائے تو میرا شوق دیکھ، میرا اشتیاق دیکھ"۔

لیکن جواب میں جو بات اللہ تعالےٰ کی طرف سے ارشاد ہوئی، وہ بہت اہم ہے بہت سبق آموز ہے - اس سے یہ سبق ملتا ہے کہ عجلت پسندی خیر کے معاملے میں بھی اچھی چیز نہیں "سہج سہجے سو میٹھا ہو" بھلائی اور خیر میں بھی جلدی سے کام لینا پسندیدہ نہیں - اللہ تعالےٰ نے فرمایا:

فَاِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَاَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ○ (۸۵)

"اے موسیٰؑ! تمہاری عجلت کا نتیجہ نکل چکا ہے اور ہم نے تمہارے پیچھے تمہاری قوم کو ایک آزمائش میں مبتلا کر دیا ہے اور سامری نے انہیں گمراہ کر دیا ہے"۔

بہرحال اس سورہ مبارکہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حالات و واقعات بہت تفصیل سے وارد ہوتے ہیں - اس کے بعد دو رکوعوں میں احوال قیامت کا ذکر بھی اور قصۂ آدم و ابلیس بھی آیا ہے - قدرے تفصیل کے ساتھ — پھر اکثر مکی سورتوں کے اسلوب کے مطابق اس سورہ مبارکہ کے آغاز میں بھی اور اسکے اختتام پر بھی - نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جانب خصوصی التفات ہے - آپ سے خصوصی خطاب ہے - چنانچہ آغاز میں فرمایا گیا تھا - " مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ○"

"اے محمدؐ! ہم نے آپ پر یہ قرآن اس لئے نہیں اتارا کہ آپ مشقت

میں پڑ جائیں یا آپ ناکام ہوں'' ''تشقیٰ'' میں یہ دونوں مفہوم موجود ہیں پہلے
پہلے مفہوم کی نظیر ہے سورہ شعراء کی آیت

لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ اَلَّا يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ۝

''اے نبی! شاید کہ آپ اپنے آپ کو ہلاک کر لیں گے۔ اس رنج و صدمے سے کہ یہ ایمان نہیں لا رہے ہے۔'' حضور پر دوہری مشقتیں تھیں۔ ایک مشقت دعوت و تبلیغ کی تھی گھر گھر جا کر کواڑوں پر دستک دینا ایک ایک دل پر دستک دینا۔ جہاں معلوم ہو جائے کہ کوئی قافلہ کسی وادی میں ٹھہرا ہوا ہے وہاں تشریف لے جانا اور اللہ کا کلام ان کو پڑھ کر سنانا۔ غرض کہ یہ ایک مشقت تھی محنت شاقہ تھی کہ جس میں آپ مبتلا تھے اور اس پر مزید یہ کہ لوگوں کے اعراض و انکار ان کی طرف سے کفر کی روش — اس کا مشاہدہ کر کے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سخت رنج و غم اور اندوہ کا سامنا ہوتا تھا۔ آخر یہ انہی کی قوم تھی اور آپ سے بڑھ کر کون جانتا تھا کہ اس اعراض اور انکار کی پاداش میں ان کو کیا سزا ملنے والی ہے۔ کیسے عذاب و ہلاکت کی یہ قوم اپنے آپ کو مستحق بنا رہی ہے۔

غرض حضور پر ایک جانب یہ دوہری مشقت تھی اور دوسری طرف اس آیت مبارکہ کا مفہوم یہ بھی ہے کہ ''اے نبیؐ! یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل نہیں ہوا کہ آپ ناکام ہوں۔ آپ کامیاب ہوں گے۔ وقتی طور پر جو مشکلات پیش آ رہی ہیں ان سے دل برداشتہ نہ ہوں۔ لوگوں کا یہ فوری ردِ عمل ہے اس سے مایوس نہ ہوں۔ حالات بہتر سے بہتر ہوں گے'' جیسے کہ سورۃ والضحیٰ میں فرمایا:

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى

''اے نبیؐ! آپؐ گھبرائیں نہیں۔ آپؐ کے لئے ہر آنے والی ساعت پہلی ساعت سے بہتر ہوگی۔ اس دنیا میں بھی حالات بہتر سے بہتر ہوتے

ہیں چلے جائیں گے اور آخرت تو آپ کے لئے اس دنیا سے بہت بہتر ہے ہی - پھر وہاں بھی لحظہ بہ لحظہ آپ کے درجات میں ترقی ہوتی چلی جائیگی،،
یہی بات سورہ قصص میں بھی آئی ہے -

إِنَّ الَّذِي فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْآنَ لَرَادُّكَ إِلَىٰ مَعَادٍ (۸۵)

"اے محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جس ہستی نے آپ پر اس قرآن کو فرض کیا ہے - اس کی تبلیغ کی ذمّہ داری آپ پر عائد کی ہے - وہ آپ کا ساتھ چھوڑنے والی نہیں ہے - آپ لوٹیں گے اس حال کو کہ جو بہت ہی عمدہ ہوگا،،

اس سورہ طٰہٰ کے آخری حصے میں بھی نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف پھر دوبارہ التفات ہے - پہلے تلقین تو ہوئی -

فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ (۱۳۰)

"اے نبیؐ صبر کیجئے اس پر جو یہ کہہ رہے ہیں،، دوسرے یہ فرمایا گیا -

وَلَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا
مِّنْهُمْ زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا لِنَفْتِنَهُمْ فِيهِ (۱۳۱)

"اے نبیؐ! ان کفار کو، سرداران قریش کو ہم نے جو کچھ دنیا کا ساز و سامان دے دیا ہے، انکے پاس دولت ہے، وجاہت ہے عزت ہے سرمایہ ہے - لیکن آپ کی نگاہوں میں ان چیزوں کی حیثیت و وقعت پرکاہ کے برابر نہیں ہونی چاہیئے - آپ کی نگاہیں کبھی ان کی طرف نہ اٹھیں - یہ سارا ساز و سامان تو درحقیقت اس لئے کہ ہم انہیں کے ذریعے سے انہیں فتنے میں مبتلا کر رہے ہیں اور درحقیقت یہ چیز ان کے لئے شامت اعمال کا سبب بن کر رہے گی -،، زَهْرَةَ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا -
یہ صرف دنیا کی زندگی کی چمک دمک ہے -

اثنائے سورت میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایک اور ہدایت بھی ہوئی جسمیں اسی عجلت پسندی سے روکا گیا - یعنی یہ کہ جلدی خبر کے

کام میں بھی اچھی نہیں ہے - فرمایا گیا -

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ (۱۱۴)

آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن سے جو محبت تھی وہ ظاہر و باطن سے معلوم ہے - لہٰذا آپؐ کو شدید انتظار رہتا تھا - آپؐ چاہتے تھے کہ قرآن جلدی جلدی نازل ہو - اس سے آپؐ کو روکا گیا - قرآن مجید کی تنزیل کے لئے جو تدریج اللہ کی حکمت میں طے شدہ ہے وہی یقیناً درست ہے اور بہتر ہے - لہٰذا اس سے پہلے آپؐ اس کے لئے جلدی نہ کریں - اور

وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝ (۱۱۴)

اپنے ربّ سے دُعا فرماتے رہا کریں کہ "اے رب میرے علم میں اور اضافہ فرما" یہ ہے اس سورہ مبارکہ کا مختصر بیان وہ جس کا آغاز ہوا طٰہٰ سے اور جیسا کہ سورہ یٰسٓ کا معاملہ ہے - طٰہٰ اور یٰسٓ دونوں کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اسماء میں شمار کیا گیا ہے -

بقول شاعر :

نگاہ عشق و مستی میں وہی اوّل وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسٓ وہی طٰہٰ

بارك الله لي ولكم في القرآن العظيم ونفعني وإياكم بالآيات والذكر الحكيم

بقیہ : قرآن مجید قرآن مجید کی روشنی میں

ہیں اور کروڑ ہا کروڑ انسان برابر اس کو سنتے آرہے ہیں اور قیامت تک یہ سلسلہ انشاء اللہ برابر جاری رہے گا تحفیظ القرآن کا یہ ایک بہت بڑا عطیہ ہے - جس کے لئے مسلمانوں کو اپنے رب کا شکر گذار ہونا چاہیئے -

قرآن مجید قرآن مجید کی روشنی میں

یہ مقالہ مولانا عبدالکریم پاریکھ صاحب نے محاضراتِ قرآنی کے اجلاس منعقدہ اکتوبر ۸۳ء میں پیش فرمایا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَاِنَّہٗ لَتَنْزِیْلُ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ نَزَلَ بِہِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۝ عَلٰی قَلْبِکَ لِتَکُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِیْنَ ۝ بِلِسَانٍ عَرَبِیٍّ مُّبِیْنٍ ۝

(سورۃ الشعراء - ۱۹۲ - ۱۹۵)

(ترجمہ) "اور بے شک یہ قرآن مجید رب العالمین کی طرف سے نازل کیا گیا۔ اس تنزیل کو لے کر روح الامین نام کے فرشتے اترے ہیں۔ اس قرآن مجید کو آپ کے قلب پر نازل کیا گیا تاکہ آپ لوگوں کے نام ہمارے نوٹس کو جاری کر دیں۔ نہایت صاف ستھری اور کھلی ہوئی عربی زبان میں اسے اتارا گیا۔"

ہم نے اپنے مضمون کی ابتداء کے لئے سورۃ الشعراء کی ان آیات کا انتخاب کیا ہے جن میں قرآن مجید کی تنزیل کے بارے میں ارشاد فرمایا گیا۔ تنزیل اور نزول اوپر سے کسی چیز کے نیچے اترنے کو کہتے ہیں۔ زمین پر بسنے والے لوگوں کی ہدایت کے لئے احکامات کا نزول ہر زمانے میں ہوتا رہا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَ	ابتدا میں لوگ ایک ہی امت تھے۔
فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ	جب ان میں بگاڑ پیدا ہوا تو ان کی ہدایت
مُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ	کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے نبیوں کو
الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ	خوشخبری دینے والے اور ڈر سنانے والے

النَّاسِ فِيمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ط	بنا کر بھیجا اور ان کے ساتھ حق کی بنیاد
(سورۃ البقرہ ۔ ۲۱۳)	پر کتابیں نازل فرمائیں تاکہ لوگوں کے درمیان

جو اختلافات پیدا ہو چکے ہوں ان کا فیصلہ ان کتابوں کے ذریعے کر دیا جائے۔

اس آیت کے ذریعہ یہ معلوم ہوا کہ آسمانی کتاب جب بھی اللہ کے کسی پیغمبر کو عطا کی گئی تو سر تا سر تنزیل تھی۔ قرآن شریف میں بارش، ملائکہ، روح اور عذاب کے لئے بھی نزول کا لفظ استعمال کیا گیا ہے اور قرآن مجید کی جو تنزیل ہوئی ہے اس کے انتظام کی ایک ترتیب ان آیاتِ بیّنات میں بتائی گئی کہ آسمانِ دنیا سے حضرت جبریل علیہ السلام قرآن مجید کو لے کر اترے اور اس قرآن مجید کو اتارنے کا مقام انسانیت کی سب سے اعلیٰ اور اشرف ہستی سب سے زیادہ مبارک اور قابلِ قدر شخصیت خاتم النّبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک کو تجویز فرمایا گیا۔ اس کا ذکر سورۂ قدر میں بھی ہمیں ملتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے انسانیت کو یہ شرف عطا فرمایا کہ اس میں سے سب سے اعلیٰ ہستی کے قلب کو نزول کی جگہ تجویز فرمائی۔ چاہتے تو پہاڑوں پر بھی قرآن نازل کر سکتے تھے لیکن اتنی زبردست، جامد اور سخت مخلوق بھی کلام الٰہی کو سنبھالنے کا سلیقہ، حوصلہ اور طاقت نہ رکھتی تھی۔ ارشادِ رب ہے:

لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ	اگر ہم اس قرآن کو کسی پہاڑ پر نازل فرماتے
لَّرَاَيْتَهٗ خَاشِعًا مُّتَصَدِّعًا	تو تم دیکھتے کہ وہ اللہ کے خوف سے دب
مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ط وَتِلْكَ الْاَمْثَالُ	کر پھٹ جاتا یہ مثالیں ہم انسانوں کے لئے
نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ	بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ اس میں غور و فکر
(سورۂ حشر ۔ ۲۱)	کریں ـــــ !!

معلوم ہوا کہ انسان کا قلب مخلوقات میں سب سے زیادہ طاقتور چیز ہے۔ کسی کہنے والے نے خوب کہا ہے ؎

جڑیں پہاڑوں کی ٹوٹ جاتیں فلک تو کیا عرش بھی کانپ اٹھتا
اگر میرا دل نہ روک لیتا تمام زورِ بیان تیرا

آسمانی نوٹس قرآن مجید انسانوں کے لئے ایک طرف تو خدا کا پیغام ہے دوسری طرف ان کے نام آسمانی نوٹس (Notice) بھی ہے کہ دنیا چھوڑنے کے بعد ہمیں کن کن منزلوں سے گذرنا ہے اور کیا حالات پیش آئیں گے جن کے لئے انہیں اپنی موجودہ زندگی

میں تیاری کرنا بھی ضروری ہے۔

عربی زبان کی وسعت

پچھلی کتابوں کی طرح قرآن مجید کو بھی آخر کسی انسانی زبان میں نازل ہونا تھا۔ عربی زبان سے بہتر پوری انسانیت کو خطاب کے لئے کوئی اور زبان ساتویں صدی مسیحی کی ابتدا میں نہیں ہو سکتی تھی۔ تب تو کیا اب بھی عربی کے سوا کوئی ایسی زبان نہیں جو ایک طرف تو خدائی کلام کی متحمل ہو اور دوسری جانب انسانی آبادی کو (چاہے وہ عربی زبان جانتی ہو یا نہ جانتی ہو) سہل الحصول طریقہ سے اللہ کا کلام سمجھا سکے۔

دنیا کی چند کلاسیکل زبانوں (Classical Languages) کے سوا اس وقت زمین پر جتنی انسانی زبانیں بولی جاتی ہیں قریب قریب ان تمام زبانوں میں قرآن مجید کے الفاظ شعوری یا لاشعوری طور پر رَواں دَواں ہیں حتیٰ کہ برصغیر ہند و پاک میں بولی جانے والی کوئی ایسی زبان نہیں جس میں قرآن مجید کے ۱۰ تا ۴۰ فیصد الفاظ جاری و ساری نہ ہوں۔

حالانکہ یہ مقالہ اس بات کا تقاضا نہیں کرتا کہ یہاں اس کی تفصیل بتائی جائے تاہم اتنا سن لیجئے کہ اسم، انعام، غضب، مکان، لباس، زوجہ، عورت، قدم، حمل، لفافہ، جہاز، امانت، وکیل، مقدمہ، عین، موقعہ، کرسی، صورت، تکیہ، سوال، جواب، جسم، بدن، وزن، خالص، دنیا، دار، غور، تعجب اور اس طرح کے ہزاروں ہزار سادے الفاظ ہیں کہ بڑی بڑی زبانوں کی کیا بات مراٹھی زبان وسطِ ہند کی چھوٹی سی زبان ہے جو قرآن مجید کے ہزاروں الفاظ اپنے دامن میں اب بھی سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ ہمارے بزرگانِ دین نے قرآن مجید کی اس ملک میں ایسی زبردست خدمت کی ہے کہ بغیر کسی تختِ سلطنت کے محض اللہ کے بھروسے اللہ کا پیغام انسانوں تک پہنچایا اور اس طاقت اور قوت کے ساتھ اللہ کے احکامات لوگوں تک پہنچائے جس کی وجہ سے قرآن مجید کے الفاظ کی ایک بڑی بھاری تعداد مقامی زبانوں پر اپنے معنی اور مفہوم کے ساتھ ایسے مسلط ہوئے کہ آج بھی ان زبانوں میں سرِفہرست وہ الفاظ بولے جاتے ہیں جو خاص الخاص قرآن مجید کے ہیں حتیٰ کہ قمیص، جیب، دماغ، فرش، قریب، مقام، دعا، عذاب، ثواب، ظلم، جرم، فضیلت، عبادت، منطق، حجت، قول و قرار، طوفان، داخلہ، اخراج، شکر، رحم، جزا، والد، اولاد، خبر، اخبار، اگر موقع ہوتا تو اس محفل میں ہزاروں الفاظ بتائے جا سکتے تھے لیکن ایک ہلکا اندازہ ہو اس لئے آپ کو چند اشارے دے دیئے گئے۔

بہرحال ان آیات بیّنات پر (جو ہم نے شروع میں تلاوت کی تھی) ایک نظر ڈال لیں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ قرآن مجید کسی انسان کی تصنیف نہیں بلکہ ربّانی تنزیل ہے اور اس تنزیل کا واسطہ فرشتۂ اعظمؑ سے رسولِ اعظمؐ تک اور رسولِ اعظمؐ سے لے کر عام انسانوں تک قائم ہوتا ہے۔ اسی لئے کسی عام انسان کو اللہ سے ہمکلام کرا دینا، یا خدا سے بات کرا دینا یا خدا کی بات اس کے منہ میں ڈال دینا یہ قرآن مجید کا سب سے بڑا اعجاز ہے۔

اس مقالہ میں کسی بحث اور تکرار کے بغیر قرآن مجید کو خود قرآن مجید کی روشنی میں دیکھنے کے لئے حسبِ ذیل آیت کو نگاہ میں رکھنا چاہیئے۔

وَلَا يَأْتُونَكَ بِمَثَلٍ إِلَّا جِئْنَاكَ بِالْحَقِّ وَأَحْسَنَ تَفْسِيرًا

(سورۃ الفرقان - ۳۳)

اس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ اے محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم آپؐ کے مخالفین کتنی ہی طاقت لگا دیں کوئی بھی بات لا کر کھڑی کریں گے۔ اس کے مقابلے میں ہم حق بات کو نازل فرما دیں گے اور اس کی نہایت حسین اور خوبصورت تفسیر بھی۔

بہت سے علمائے ربّانی نے اس آیت سے یہ استدلال بھی کیا ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت کی شرح میں اسی مضمون پر مشتمل دوسری آیات کو لا کر بات سمجھی یا سمجھائی جائے تو آدمی وحی کے فطری دائرے سے ہٹنے کے خطرے سے محفوظ ہو جائے گا۔

یہاں یہ بات بھی نہ بھولنی چاہیئے کہ قرآن مجید کی عمومی شرح و تفسیر، احکامات میں خلاصہ، احکاماتِ الٰہی کو نافذ کرنے کی ترکیب و ترتیب، نیز انسانی زندگی کے جملہ معاملات میں چاہے وہ سماجی ہوں یا انفرادی، تمدّنی ہوں یا عمرانی، عبادات کے ہوں یا معاملات کے، امورِ سلطنت کے ہوں یا زمین میں کسی طرح کے بھی بندوبست سے متعلق ہوں اس کے لئے صاحبِ قرآن جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا اسوۂ حسنہ حدیث شریف کی روشنی میں ہمارے پاس موجود ہے۔ نیز آپؐ کے صحابہ کی نورانی زندگیاں، علمی فیصلے اور عملی نمونے یہ تمام کی تمام ربّانی نعمتیں اس امّت کے پاس آج تک محفوظ ہیں۔ یہ بھی قرآنِ مجید کی تفسیر کا ایک مضبوط اور بے ضرر اور نہایت ہی معتبر ذریعہ ہے جو مسلمانوں کے سوا کسی آسمانی کتاب کی دعویدار امّت کے پاس موجود نہیں۔

اور پہاڑ، روشنی اندھیرا، پیدائش اور موت، پوری زمین کا اپنے محور پر گھومنا اور مدار میں گردش کرنا، موسموں کا پھیر بدل، قطرۂ منی پر انسان کی تصویر کا بن جانا، بطن مادر میں ایک مدت تک کے لئے استقرار، پھر جس راستے سے اس کا دنیا میں آنا یہاں چند دن رہنے کے بعد میں قبر میں سونپا جانا، نسلاً بعد نسل ہر سو سال کی مدت میں انسانی قافلوں کے ڈیروں کا اٹھ جانا اور اس کی جگہ دوسروں کا لے لینا۔ عورت اور مرد کے جوڑے کا تناسب، انسان کی دنیاوی حیات کے لئے اس کی ساری ضرورتوں کا پورا ہو جانا، انسان کی اختیاری زندگی میں اسے ایک حد تک آزادی کا ملنا۔ غیر اختیاری زندگی میں فطرت کے شکنجے میں اس کا بے بس ہونا کیا یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل نہیں کہ انسان کی زندگی کا دائرہ غیر انسانی ذی ارواح کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ اور پھر ایک طرف تو زندگی کے دائرے کا وسیع ہونا اور دوسری طرف عمر دراز کے ڈھانچہ کا ایک صدی کے اندر اندر ہی بکھر جانا جو بھی یہاں سے مر کر چلا گیا ہو اس کا واپس نہ آنا، کسی انسان نے اگر اپنی فطرت کو مسخ نہیں کیا تو یہ سب باتیں آج کے دور میں ایک عالمی ہدایت نامہ کی انسانیت کے لئے محتاجی کی دلیل ہیں۔

انسانی زندگی کے پچھلے ادوار میں زمین پر چونکہ آبادی اتنی گھنی نہیں تھی اور ان کے مسائل اور وسائل دونوں محدود تھے تو اللہ نے ان کے لئے مقامی ہدایت ناموں سے اور علاقائی نبوتوں سے حیاتِ دنیا کا بندوبست قائم کر دیا۔ لیکن اب آدمیت کا کنبہ پوری زمین پر پھیل چکا ہے اور زمین باوجود وسیع ہونے کے انسانیت پر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے ادوار میں ایشیا، یورپ، افریقہ، وغیرہ کے انسان ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے۔ لیکن نزولِ قرآن کے بعد ان کے تعلقات عالمی سطح کے ہو گئے اور اب تو موجودہ زمانے کے لوگوں کے وسائل اور مسائل کا دائرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ پورے انسانی قافلے کے لئے تمام براعظم گھر آنگن بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کسی مقامی ہدایت نامہ سے یا علاقائی نبوت سے آگے بڑھ کر سارے عالم کے لئے ایک ہی نصیحت نامہ اور ایک ہی نبوت کا انسانی فطرت برابر تقاضا کئے جا رہی تھی۔ اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرمائی اور آپ پر نزولِ قرآن کی تکمیل بھی فرما دی۔ اس لئے اب یہ ماننے اور قبول کرنے کے سوا

(سورۂ مریم - ۶۴) بغیر اترہی نہیں سکتے جب اس کا حکم
ہوتا ہے تب ہی ہم پیغام لے کر نازل ہوتے ہیں

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک موقع پر طویل مدت تک جبرئیل علیہ السلام کے نہ آنے پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ہوا اور جب حضرت جبرئیل علیہ السلام زمین پر آئے اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری دی تو شوقِ ملاقات میں حضرت نے فطری طور پر دریافت فرمایا کہ اتنی طویل مدت انتظار کرایا۔ بہت دیر کے بعد آئے ہو اس پر جبرئیل امینؑ نے یہ جواب دیا کہ ہم آپؐ کے پروردگار کے حکم کے بغیر نازل نہیں ہو سکتے ——— !!

مکمل انتظامات سے بھرپور پکا اور صحیح راستہ

اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَهْدِيْ	بلاشبہ یہ قرآن وہ صحیح راستہ دکھاتا ہے
لِلَّتِيْ هِيَ اَقْوَمُ	جو نہایت ہی مضبوط بندوبست والا
(سورۂ بنی اسرائیل - ۹)	سیدھا راستہ ہے

آدمی کی زندگی کے سفر میں بے شمار پگ ڈنڈیاں آتی ہیں، پھیر بدل کی راہیں آتی ہیں۔ راستہ مضبوط اور بندوبست معقول ہو، صراطِ مستقیم ہو ایسا راستہ کلام الٰہی نے دنیا میں جاری کر دیا۔ اب کسی کو زحمت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔ آسان اور صحیح راستہ یہی ہے۔

انسان کو دنیا کے سفر کا نقطۂ آغاز کس طرح شروع کرنا پڑا اور وہ کہاں سے آیا؟ کیوں آیا؟ اس کو زمین پر رہنے بسنے کا کتنا وقفہ دیا گیا؟ موت کیا ہے؟ موت کے بعد انسان کہاں جاتا ہے؟ مرنے کے بعد آدمی پر کیا بیتے گی؟ کن کن منزلوں سے اس کا واسطہ پڑنا ہے؟ کیا یہاں کی زندگی مکمل ہے؟ اور اس کے بعد کسی دوسری زندگی کا ہونا ممکن نہیں۔ کیا آدمی بغیر کسی چیز کے پیدا ہو گیا؟ یا خود اس نے اپنے آپ کو پیدا کر لیا؟ کیا انسان کا کوئی مالک اور خالق نہیں؟ کیا انسان کسی کے سامنے جوابدہ نہیں؟ کیا دنیا میں اس نے جو کام انجام دیئے ہیں اچھے یا برے ان کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں؟ اگر نکلنے والا ہے تو اس کی کیا صورت ہو گی؟ کیا اس بغیر ستون کے آسمان کا کوئی بنانیوالا نہیں ہے؟ کیا سورج چاند ستارے، ہوا، بادل، پانی، سمندر، ندی نالے، دریا، جنگلات

اور پہاڑ، روشنی اندھیرا، پیدائش اور موت، پوری زمین کا اپنے محور پر گھومنا اور مدار میں گردش کرنا، موسموں کا پھیر بدل، قطرۂ منی پر انسان کی تصویر کا بن جانا، بطن مادر میں ایک مدت تک کے لئے استقرار، پھر جس راستے سے اس کا دنیا میں آنا یہاں چند دن رہنے کے بعد میں قبر میں سونپا جانا، نسلاً بعد نسل ہر سو سال کی مدت میں انسانی قافلوں کے ڈیروں کا اٹھ جانا اور اس کی جگہ دوسروں کا لے لینا۔ عورت اور مرد کے جوڑے کا تناسب، انسان کی دنیاوی حیات کے لئے اس کی ساری ضرورتوں کا پورا ہو جانا، انسان کی اختیاری زندگی میں اسے ایک حد تک آزادی کا ملنا۔ غیر اختیاری زندگی میں فطرت کے شکنجے میں اس کا بے بس ہونا کیا یہ سب چیزیں اس بات کی دلیل نہیں کہ انسان کی زندگی کا دائرہ غیر انسانی ذی ارواح کے مقابلے میں زیادہ وسیع ہے۔ اور پھر ایک طرف تو زندگی کے دائرے کا وسیع ہونا اور دوسری طرف عمر دراز کے ڈھانچہ کا ایک صدی کے اندر اندر ہی بکھر جانا جو بھی یہاں سے مر کر چلا گیا ہو اس کا واپس نہ آنا، کسی انسان نے اگر اپنی فطرت کو مسخ نہیں کیا تو یہ سب باتیں آج کے دور میں ایک عالمی ہدایت نامہ کی انسانیت کے لئے محتاجی کی دلیل ہیں۔

انسانی زندگی کے پچھلے ادوار میں زمین پر چونکہ آبادی اتنی گھنی نہیں تھی اور ان کے مسائل اور وسائل دونوں محدود تھے تو اللہ نے ان کے لئے مقامی ہدایت ناموں سے اور علاقائی نبوتوں سے حیاتِ دنیا کا بندوبست قائم کر دیا۔ لیکن اب آدمیت کا کنبہ پوری زمین پر پھیل چکا ہے اور زمین باوجود وسیع ہونے کے انسانیت پر تنگ ہوتی جا رہی ہے۔ پچھلے ادوار میں ایشیا، یورپ، افریقہ، وغیرہ کے انسان ایک دوسرے کے لئے اجنبی تھے لیکن نزولِ قرآن کے بعد ان کے تعلقات عالمی سطح کے ہو گئے اور اب تو موجودہ زمانے کے لوگوں کے وسائل اور مسائل کا دائرہ اتنا بڑھ گیا ہے کہ پورے انسانی قافلے کے لئے تمام براعظم گھر آنگن بن کر رہ گئے ہیں۔ ایسے موقعوں پر کسی مقامی ہدایت نامہ سے یا علاقائی نبوت سے آگے بڑھ کر سارے عالم کے لئے ایک ہی نصیحت نامہ اور ایک ہی نبوت کا انسانی فطرت برابر تقاضا کئے جا رہی تھی۔ اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت فرمائی اور آپ پر نزولِ قرآن کی تکمیل بھی فرما دی۔ اس لئے اب یہ ماننے اور قبول کرنے کے سوا

انسانیت کے لئے کوئی اور چارہ نہیں رہ گیا کہ قرآن مجید ہی تمام انسانیت کے لئے ایک عالمی ہدایت نامہ ہے۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ (ص ۸۷)	یہ قرآن تو اہلِ عالم کے لئے نصیحت ہے۔

قرآن مجید کے نزول کے مقاصد اور ترتیب پر حسبِ ذیل آیت ہمیں صاف صاف ہدایت دیتی ہے۔

وَقُرْاٰنًا فَرَقْنٰهُ لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّ نَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا ۝ (بنی اسرائیل - ۱۰۶)	اور اس قرآن کو ہم نے جدا جدا آیات میں اور وقفے کے ساتھ نازل فرمایا۔ تاکہ تم انسانوں پر اسے پڑھ کر سناؤ۔ اور ہم نے ایک مخصوص انداز کے ساتھ اسے نازل فرمایا ہے۔

نزولِ قرآن میں ایسا نہیں ہوا کہ پوری کتاب یکجا طور پر اتار دی گئی ہو بلکہ تھوڑا تھوڑا اور وقفے کے ساتھ ۲۳ برس کی مدت تک نزول ہوتا رہا۔ اتنی طویل مدت تک نزول کے بعد بھی مضامین میں یکسوئی، مقصدیت، عبارت میں بندش، ٹھوس اور ناقابلِ تبدیل حقائق کا ایک تسلسل ہے اور دھارا ہے جو کبھی ٹوٹنے نہیں پاتا۔ یہ بات کسی انسانی تصنیف میں نہیں پائی جاتی بلکہ کسی مصنف یا اہلِ قلم نے ۲۳ سال تصنیف کا کام کیا ہو تو ضروری نہیں کہ اوّل تا آخر اس کے سوچنے، بولنے اور لکھنے میں مقصد اور فکر کی یکسوئی پائی جاتی ہو بلکہ اسلوب اور اندازِ بیان تو کیا اتنی مدت میں آدمی کا نظریہ بھی بدل جاتا ہے اور پہلے کہی ہوئی بات سے یا تو رجوع کر لیتا ہے یا کوئی نئی راہ اختیار کر لیتا ہے۔ دنیا کے تمام اہم اور کثیر التصانیف مصنفین کی تحریر میں یہ نقص پایا جانا ایک فطری انسانی کمزوری ہے جس سے کسی بڑے سے بڑے مصنف کو بھی فرار نہیں جبکہ قرآن مجید اپنے اندازِ بیان میں مقصد اور اصول میں نظریۂ حیات میں اوّل تا آخر ایک ہی تسلسل پر قائم ہے۔ یہ دلیل ہے اس کے مُنَزَّل مِنَ اللّٰہ ہونے کی۔ اسی لئے فرمایا ہے کہ:

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ	کیا ان لوگوں نے قرآن میں تدبر

وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (سورۂ نساء-۸۲)	نہیں کیا کہ اگر یہ کسی غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں یہ لوگ بہت اختلاف پاسکتے تھے۔

قرآن پڑھنے میں عجلت نہ کریں

قرآن مجید کو پڑھنے کا طریقہ بھی قرآن مجید میں بتادیا گیا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ (سورہ المزمل - ۴)	قرآن مجید کو ٹھہر ٹھہر کر اور تھم تھم کر پڑھو۔

یہ بھی فرمایا گیا کہ:

وَلَا تَعْجَلْ بِالْقُرْاٰنِ مِنْ قَبْلِ اَنْ يُّقْضٰٓى اِلَيْكَ وَحْيُهٗ وَقُلْ رَّبِّ زِدْنِيْ عِلْمًا ۝ (سورۂ طٰہٰ - ۱۱۴)	قرآن مجید کو پڑھنے میں عجلت مت کرو اس کے پہلے کہ اس کی وحی تم پر پوری کی جائے یوں دعا کرتے رہو کہ اے میرے پروردگار میرے علم کو اور بڑھا دے۔

اور ہمیں یہ آیت بھی قرآن شریف میں ملتی ہے کہ:

لَا تُحَرِّكْ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعْجَلَ بِهٖ ۝ اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ ۝ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِعْ قُرْاٰنَهٗ ۝ ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا بَيَانَهٗ ۝ (سورۂ القیمہ ۱۹-۱۶)	(صاحب قرآن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم دیا گیا کہ اپنی زبان کو تیزی کے ساتھ حرکت میں لاکر عجلت نہ کیجئے۔ اس کا جمع کر دینا اور اس کا پڑھا دینا تمام ہمارے ذمہ ہے۔ جب ہم اس کی قرأت تم پر کر دیں تو اسی کو اتباع میں تم پڑھتے رہو۔

حضرت شاہ عبدالقادر صاحب محدث دہلویؒ نے اس آیت کے حاشیہ میں یہ ارشاد فرمایا کہ جبرئیلؑ کے پڑھنے کو اپنا پڑھنا فرمایا گیا۔

حدیث شریف کی بعض روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبرئیلؑ جب تشریف لاتے اور قرآن مجید پڑھ کر سناتے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی تیزی کے ساتھ ان کے ساتھ ساتھ پڑھنا شروع فرمادیتے۔ لیکن یہ ایک بڑی زبردست معجزہ کی بات ہوئی کہ حضورؐ کو یہ فرمادیا گیا کہ آپؐ اس طرح نہ کریں بلکہ جو قرأت ہو رہی ہے اسے سنیں۔ آپؐ کے دل میں اس قرآن مجید کو

جمع کر دینا اور پھر آپ کی زبانِ مبارک سے اس کا پڑھوا دینا یہ سب ہمارے ذمّہ ہے۔

عالمی ہدایت نامہ قرآن مجید انسانوں کی ہدایت کے لئے نازل فرمایا گیا یہ اس معنٰی کی کوئی کتاب نہیں ہے جس معنٰی میں لوگ بعض دھارمک اور مذہبی کتابوں کا تصوّر رکھتے ہیں بلکہ اس کتاب کی حیثیت کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کی پانچ نمبر کی سورۃ، سورۃ مائدہ کی ۶۷ نمبر کی آیت میں ارشاد فرمایا:

يٰاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ؕ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ؕ (سورۂ مائدہ - ۶۷)	اے اللہ کے رسول جو کچھ آپ کی طرف اللہ نے کلام نازل فرمایا اس کو لوگوں تک پہنچا دیجئے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو رسالت کا حق ادا نہ ہو گا۔ رہا لوگوں کی مخالفت کا معاملہ اور ان کے مقابلے

کی بات تو ان تمام مواقع پر اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے گا اور آپ کے دشمنوں سے خود نپٹ لے گا۔

قرآن شریف میں اللہ تعالیٰ نے ایک جگہ یہ بھی فرمایا کہ:

عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ ۝ (سورۂ رعد - ۴۰)	آپ کا کام پہنچا دینا ہے اور ہمارا کام حساب لینا ہے۔

کہیں یہ بھی ارشاد ہوا کہ:

بَلٰغٌ ج فَهَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ (سورۂ الاحقاف - ۳۵)	ہماری بات پہنچا دو اور جو نہیں ماننے والے ہیں اور نافرمان ہیں انہیں کو ہلاک کیا جائے گا۔

تمام آسمانی صحیفوں کا محافظ قرآن مجید کا یہ دعویٰ ہے کہ اللہ کے سوا کوئی طاقت بھی اسے بنا کر نہیں لا سکتی سورۂ یونس میں یہ مضمون بیان ہوا کہ

وَمَا كَانَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ بَيْنَ يَدَيْهِ	یہ قرآن ایسا نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کوئی بھی اسے ترتیب دے سکے یا بنا سکے لیکن اس کی شان ہے کہ وہ تصدیق کرتا

وَتَفْصِيلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝
(سورۂ یونس - ۳۷)

ہے اپنے سے پہلی کتابوں کی اور ایک مفصل کتاب ہے جس میں کسی طرح کے شک کی گنجائش نہیں اور رب العلمین کی طرف سے اسے نازل فرمایا گیا۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ قرآن شریف کی ایک شان یہ بھی ہے کہ وہ اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ انجیل خدا کی کتاب نہیں ہے، وہ یہ بھی نہیں کہتا کہ توریت اللہ نے نازل نہیں فرمائی۔ وہ کسی صحیفۂ ربانی کا انکاری نہیں اس نے یہ بھی نہیں کہا کہ صحیفۂ ابراہیمؑ کو مت مانو اور صحیفۂ موسیٰؑ ماننے کے قابل نہیں بلکہ اس نے تو یہ کہا کہ اے اہل کتاب! تم ایک بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان برابر ہے۔

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔
(سورۂ آل عمران - ۶۴)

آپؐ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب آؤ ایک بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے وہ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی نہ کریں اور اللہ کے ساتھ کسی کو بھی شریک نہ ٹھہرائیں اور نہ ہم آپس میں ایک دوسرے کو رب قرار دیں۔

اہل علم اس کے معنی خوب سمجھتے ہیں اگر کوئی شخص قرآن مجید پر ایمان لے آتا ہے اور وہ موسوی ہے تو اسے اس کا موسیٰؑ بھی مل گیا اور توراۃ بھی اس کے ہاتھ آگئی — کوئی شخص قرآن مجید کو اگر اپنے ایمان کی بنیاد بنالیتا ہے اور وہ مسیحی ہے تو اس کا عیسیٰؑ بھی اسے مل گیا اور انجیل بھی اس کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ قرآن مجید کی ایک آیت اگر زیر مطالعہ رہے تو یہ بات مزید تفصیل کے ساتھ سمجھی جاسکتی ہے

وَلْيَحْكُمْ اَهْلُ الْاِنْجِيْلِ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ؕ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝
(سورۂ مائدہ - ۴۷)

اہل انجیل کو چاہیئے کہ انجیل میں جو کچھ اللہ نے نازل فرمایا اسی کے مطابق فیصلہ کریں جو شخص بھی اللہ کے حکم کو نہ مانے ایسے ہی لوگ نافرمان ہیں۔

اس آیت شریفہ میں بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ فِیْہِ میں غور کرنے کی ایک بات ہے معلوم ہوا کہ انجیل میں جو اللہ نے نازل فرمایا وہ کلام بھی کسی درجہ میں ہے اور لوگوں نے جو انجیل میں ملاوٹ کی ہے خدا کی کتابوں میں جو کچھ ڈالا نکالا ہے وہ بھی انجیل کے ساتھ وابستہ ہو گیا۔

لیکن قرآن مجید اس شان کی کتاب ہے کہ پچھلی آسمانی کتابوں پر مھیمن ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے پچھلے زمانے میں جو کتابیں نازل فرمائی گئی ہوں ان میں سے ہر ایک کا وہ محافظ ہے۔ اسی لئے ارشاد ہوا کہ مُھَیْمِنًا عَلَیْہِ (سورۂ مائدہ ۔۴۸)

قرآن مجید عام آسمانی کتابوں پر حفاظت اور نگہداشت کی ذمہ داری کو قبول کرتا ہے۔ اس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والتسلیم میں سے ہر ایک اپنے سے قبل مبعوث فرمائے گئے نبی کی تصدیق کرتا ہے اور اپنے سے پہلے آئی ہوئی کتاب پر ایمان بھی رکھتا ہے۔ وہ یہ نہیں کہتا کہ پہلے نبی نے جو بات کہی تھی وہ برابر نہیں تھی اور وہ پہلی آسمانی کتابوں میں جو حکم بتایا گیا ہے وہ ٹھیک نہیں تھا بلکہ وہ تو یہ کہتا ہے زمانے کے لوگوں کو کہ اگر تم اہل کتاب ہو تو تمہیں اللہ کی کتاب کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ بعثتِ محمدی کے پہلے جتنے نبی دنیا میں بھیجے گئے ان میں سے چند کو چھوڑ کر قریب قریب تمام انبیاء کو بندگی کی سطح سے اٹھا کر الوہیت کی حدوں میں داخل کرنے میں شیطان کا چھاپا اتنا تگڑا رہا کہ بہت سی بڑی بڑی قوموں میں نبوت اور رسالت پر پردہ پڑ گیا اور جو نبی آیا اسے خدا کا اوتار بتا دیا گیا۔ پھر اس اوتاری سلسلہ میں غیر نبی بھی شامل کر لئے گئے۔ اس گورکھ دھندے کے سبب شرک اور کفر کی ایک ایسی معجون مرکب بن گئی کہ نبوت کا تلاش کرنا ذی فہم انسانوں تک کے لئے مشکل ہو گیا۔ حتیٰ کہ زیادہ طویل مدت کی تو بات ہی اور رہے آج سے دو ہزار سال پہلے کی نبوت عیسوی کو الوہیت کے دائرے میں داخل کر کے مسیحی دنیا نبی سے محروم ہو کر شرک کے عمیق غار میں جا گری۔

پھر قدیم زمانے کے لوگوں کا کیا حال ہوا ہوگا کہ ایک طرف تو انہیں نبی اور غیر نبی کی پہچان مشکل اور دوسری طرف رہبر اور معبود کی پہچان بھی مشکل ہو گئی۔ شیطان نے ایسی

چالاکی سے یہ کام کیا کہ سارے انسانوں کا دین ایک ہوتے ہوئے بھی اس نے عقیدۂ نبوّت کو بحث و تکرار میں ڈال کر ہر نبی کے نام پر سینکڑوں جتھے دار یاں قائم کر کے کئی کئی مذاہب کی تشکیل کر دی۔ سلام ہو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کہ آپؐ کی تشریف آوری اور نزولِ قرآن کے بعد تمام سمجھ دار لوگوں کو ایسے باطل عقیدوں سے بچنے کے لئے فطری اور قدرتی راستہ مل گیا۔

تدبّر اور تفکّر کی دعوت

قرآن مجید نے انسانوں کو تدبّر اور تفکّر کی دعوت دی۔ اس نے کسی کا اندھا اور بہرا ہو کر بے سوچے سمجھے کسی بات پر چلنا پسند نہیں فرمایا۔ سورۂ ص کی آیت نمبر ۲۹ میں یہ بیان ہے۔

كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ	یہ ایک کتاب ہے جس کو ہم نے نازل
مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ	فرمایا ہے اے محمدؐ آپؐ کی طرف اس
وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝	کتاب کو بھیجا گیا ہے جو نہایت ہی
(سورہ ص ۔ ۲۹)	مبارک ہے اس لئے کہ اس کتاب

کی آیات پر یہ لوگ تدبّر کریں اور جو عقل مند لوگ ہیں صاحبِ سمجھ ہیں وہ اس سے نصیحت حاصل کریں۔

قرآن شریف نے تفکّر سے تدبّر سے، تذکیر سے اور عقل سے منع نہیں کیا بلکہ اس نے تو یہ کہا کہ:

وَيَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَى	جو لوگ عقل سے کام نہیں لیتے اور
الَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ ۝	خدا کی دی ہوئی عقل کا صحیح استعمال
(سورۂ یونس ۔ ۱۰۰)	نہیں کرتے اللہ تعالیٰ انہیں گندگی

کے اندر پھینک دیتا ہے۔

جو لوگ آسمانی کتاب نہیں رکھتے اور جن کے پاس نورِ نبوّت کا روشن چراغ نہیں ہے وہ بھلے ہی اندھیرے میں رہنا پسند کرتے ہوں لیکن جو امّت صاحبِ کتاب اور صاحبِ نبیؐ امّت ہے اس کے لئے اندھیرے میں رہنا کبھی بھی مناسب نہیں ٹھہرایا گیا۔

قرآن شریف نے اپنے بارے میں کہا کہ:۔

نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ٥ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ٥

(سورۂ مائدہ ۱۶-۱۵)

روشنی ہے اور کھلی ہوئی کتاب ہے جس کے ذریعے اللہ تعالیٰ اپنی رضا پر چلنے والوں کو سلامتی کی راہ پر ڈال دیتا ہے۔ اور تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آتا ہے اور ہر اس شخص کو راہِ راست پہ لگا دیتا ہے جو سیدھے راستے کی طرف چلنا چاہے۔

ارشادِ باری تعالیٰ ہے کہ :-

وَالَّذِيْنَ اِذَا ذُكِّرُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوْا عَلَيْهَا صُمًّا وَّعُمْيَانًا ٥

(سورۂ الفرقان - ۷۳)

رحمٰن کے بندے وہ ہیں کہ ان پہ اللہ کی آیتیں ہی کیوں نہ پڑھی گئی ہوں قرآن شریف پڑھ کر بھی انہیں کیوں نہ سنایا گیا ہو تب بھی وہ اس پہ اندھے بہرے ہو کر ہرگز نہیں گریں گے۔

بلکہ اس پہ غور و فکر کریں گے۔ غور و فکر کرنا تدبّر کرنا قرآن مجید میں منع نہیں کیا گیا۔ سورۂ یوسف کی ابتدا میں آپ کو یہ آیت ملے گی۔

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ٥

(سورۂ یوسف - ۲)

ہم نے اس قرآن کو عربی زبان کا بنا کر نازل فرمایا تاکہ تم عقل سے اور سمجھ بوجھ سے کام لو۔

عقل اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کو ایک نہایت ہی عظیم نعمت دی گئی۔ اس نعمت کی جو لوگ قدر کرتے ہیں ان ہی کو آسمانی کتابوں کی اور آسمانی ہدایات کی قدر ہوتی ہے۔

جنگی قیدی اور قرآن

پچھلی جنگِ عظیم کے بارے میں ہم میں سے بہت سے کافی تفصیلات سے واقف ہیں۔ جاپانیوں نے جب اتحادیوں کو گرفتار کیا تو ان جنگی قیدیوں کے ساتھ یہ سلوک کیا گیا کہ زندہ چھپکلیاں انہیں نگلوائی گئیں۔ اور انہیں کئی کئی دنوں تک پیٹیوں کے اندر بند کر دیا گیا۔ اسی طریقہ

اتحادیوں یعنی امریکہ روس اور برطانیہ نے جب جرمنی اور جاپان کے جنگی قیدیوں کو اپنے قابو میں لیا تو انہیں سخت عبرت ناک سزائیں دیں کہ بعض بعض کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ لوہے کی سلاخیں تپا کر ان کی ناک کے نتھنوں میں ڈالی گئیں۔ اور پنجیں یا زنبورہ سے ان کے ناخن کو اس قدر زور سے دبایا گیا کہ وہ اپنے ملک کے خفیہ راز کو اگل دیں۔ اس اطلاع سے ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ دنیا میں جنگی قیدیوں کا اس زمانے میں (جس کو ہم تہذیب و تمدن کے عروج کا زمانہ کہتے ہیں اور علم کا زمانہ کہتے ہیں، سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور کہتے ہیں) جب یہ حال ہے تو قدیم زمانے کے جاہلوں نے بھلا کیا کچھ نہ کیا ہوگا۔

اس کے مقابلے میں قرآن مجید میں آپ جنگی قیدیوں کے بارے میں پڑھیں گے تو سورۂ توبہ کی چھٹی آیت میں آپ کو یہ مل جائے گا کہ :-

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ	اے محمدؐ! مشرکین میں سے اگر کوئی
اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى	شخص آپؐ سے پناہ کا طالب ہو تو
يَسْمَعَ كَلٰمَ اللّٰهِ ثُمَّ	اسے آپؐ پناہ دے دیجئے اور یہاں تک
اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ	اسے اپنے پاس روکے رکھئے کہ وہ
بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ۔	اللہ کے کلام کو سن لے اور جب وہ
(سورۂ التوبہ - ۶)	اللہ کے کلام کو سن لے تو پھر اس کو اس

کی جائے امن تک پہنچا دیجئے یہ اس لئے کہ یہ لوگ ایسی قوم کے افراد ہیں جو حق کو نہیں جانتے

یعنی سچائی کے مقابلے میں، اللہ کی وحی کے مقابلے میں اور توحید کے مقابلے میں مشرکین نے جو جنگ چھیڑ رکھی ہے اس کی بنیاد کسی علم پر نہیں بلکہ محض جہالت پر اور رسومات کے اوپر ہے۔ آپ کے ذمے ہم نے یہ بات ڈالی ہے کہ آپ اللہ کے کلام کو لوگوں تک پہنچا دیں۔ اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ایسے خطرناک موقع پر جبکہ جنگی قیدی کو چھوڑنے پر بہت سی مشکلات کا سامنا اہل ایمان کو کرنا پڑ سکتا تھا لیکن نے اس خطرہ کو مول لینے کی اور اس کے بعد آنے والی مصیبتیں تھیں، اس کی کوئی پرواہ نہیں کی گئی۔ اور جنگی قیدیوں کے اس حق کو تسلیم کیا گیا کہ انہیں پہلے اللہ کا کلام سنا دیا

جائے پھر انہیں جائے امن تک پہنچا دیا جائے کہ وہ اپنی حالت کے اوپر غور کریں۔

قرآن کو لوگوں تک پہنچانا کوئی بھی شخص اگر غور و فکر کے ساتھ قرآن مجید کو پڑھے گا اور دھیان سے اس کی تلاوت کرے گا تو اسے یہ بات ماننی پڑے گی کہ صاحبِ قرآن جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ذمہ داری کو بہت ہی حسن و خوبی کے ساتھ نبھایا کہ جو کتاب آپؐ پر نازل فرمائی گئی تھی اسے آپؐ لوگوں تک پہنچا دیں۔ اس ذمہ داری کو ادا کرنے کے لئے آپؐ نے بڑے بڑے خطرے مول لئے۔ اس کا ایک اشارہ سورۂ یونس کی آیت نمبر ۱۵ میں ملتا ہے۔ صرف اشارہ ہی نہیں بلکہ واقعہ کی پوری تفصیل ہمیں معلوم ہو جاتی ہے۔ ارشادِ رب ہے:

وَ اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَیْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ قُلْ مَا یَكُوْنُ لِیْۤ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِیْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ ۚ اِنِّیْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَیْتُ رَبِّیْ عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ۝ قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَیْكُمْ وَ لَاۤ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِیْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝

(سورہ یونس ۱۵-۱۶)

جب اُن پر ہماری آیتیں صاف صاف پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ ہماری ملاقات کے امیدوار نہیں ہیں وہ پیغمبر سے یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے سوا کوئی اور چیز لے آؤ یا اس میں کچھ ردّ و بدل کر دو۔ آپؐ ان سے فرما دیجئے کہ یہ میرے بس کی بات نہیں کہ میں اسمیں سے اپنے جی سے کوئی چیز بھی تبدیل کر سکوں۔ میں تو چل پڑا ہوں اس وحی کی طرف جو میری طرف کی گئی۔ اور اگر میں نے ایسا کیا یعنی اس میں کسی طرح کی تبدیلی کی بات سوچی تو مجھے خوف ہے کہ اگر یہ نافرمانی میں نے کی تو اپنے پروردگار کی طرف سے بڑے دن کے عذاب کا مجھے اندیشہ ہے۔ آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی مشیت ہوتی کہ میں اس قرآن کو تمہیں پڑھ کر نہ سناؤں تو نہ سناتا اور اس کی خبر بھی تمہیں نہ

دیتا اس سے پہلے عمر کا ایک حصّہ میں نے تم میں گذارا ہے کیا تم عقل سے کام نہیں لیتے۔

یہ آیات ہمیں چند اشارے دیتی ہیں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ صاحبِ قرآن جناب محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم اس بات پر مامور تھے کہ وہ لوگوں کو قرآن مجید سنائیں جنہیں قرآن مجید سنایا جارہا تھا ان لوگوں نے اعتراضات کئے۔ اس میں سے ایک اعتراض یہ تھا کہ اس قرآن کے سوا اور کوئی بات کرو تو بات آگے بڑھے یا پھر اس میں کچھ تبدیلی کرلو۔ تو یہ فرمایا گیا کہ اسطرح کی تبدیلی کرنا میرے اپنے جی سے ممکن نہیں اور یہ بات مجھ سے ہو بھی نہیں سکے گی لہٰذا اسطرح کا سوچنا بھی ایک بہت بڑے بھاری عذاب کو اپنے سر لینے والی بات ہوگی۔ ایک اشارہ اس کے اندر یہ بھی ملتا ہے کہ یہ اللہ کی مشیّت ہے کہ میں نے اس کی تلاوت کی جب اس کا کوئی ارادہ نہیں تھا تو نہ اس نے کلام مجید نازل فرمایا اور نہ ہی میں نے اس کی تلاوت کی تھی اور تمہیں کوئی خبر بھی نہیں تھی کہ یہ قرآن مجید مجھ پر اتارا گیا ہے۔ اپنی عمر کا ایک بڑا حصّہ میں نے تمہارے درمیان رہ کر گزارا ہے۔

نزولِ قرآن کے پہلے تقریباً چالیس سال کی زندگی آپؐ نے مکّہ میں گذاری تھی۔ اسی کو دلیل بنایا گیا یہ فرمایا گیا کہ کیا تم میں عقل نہیں کہ چالیس سال تک ایک آدمی تم سے اس طرح کی کوئی بات نہیں کہتا۔ اب اللہ کی طرف سے اس پر جو حکم نازل کیا گیا ہے اسے غور سے سننا چاہیئے اور عقل کی کسوٹی پر اس کو پرکھنا چاہیئے نہ یہ کہ اس سے مطالبات کئے جائیں کہ یہ کردو اور وہ کردو۔

معترضین کی اس طرح کی بہت ساری باتیں ہیں جس کا تذکرہ قرآن مجید میں فرمایا گیا مثلاً ایک جگہ ارشاد ہوا بات تو دراصل مشرکینِ مکّہ میں سے مخالف گروہ کی ہے۔ انہوں نے کہا کہ:

لَوْ لَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى	کہ یہ قرآن ان دونوں بڑی بڑی بستیوں
رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝	میں کے کسی عظیم آدمی پر کیوں نہیں
(سورۂ زخرف : ۳۱)	اتارا گیا۔

یعنی مکّہ اور طائف کے اندر بڑے بڑے رئیس تھے۔ ان میں سے کسی ایک پر اتارا جانا چاہیئے تھا۔ کیا ضرورت تھی کہ محمد بن عبداللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نامی ایک جوان پر یہ اتارا جائے۔

قرآن مجید میں ایک جگہ یہ فرمایا گیا کہ

اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَةَ رَبِّكَ ط
(سورۂ زخرف : ۳۲)

کیا یہ تمہارے پروردگار کی رحمت کی تقسیم کے ٹھیکیدار بن گئے ہیں جو ایسی بات کہتے ہیں۔

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا

ہم نے حیات دنیا کی معیشت بھی خود ان کے اندر تقسیم کر دی ہے۔

(سورہ زخرف : ۳۲)

اور اپنی مرضی سے جس کو جتنا چاہا دیا جب دنیا کی معیشت جو ایک دن ختم ہونیوالی ہے اور زوال پذیر ہے، اس کو دینے میں ہم نے ان سے پوچھا نہیں تو اس رحمت ربانی جس سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہو سکتی، اس کے نزول کے بارے میں ہم ان سے بھلا کیونکر پوچھیں کہ کس پر اتاریں اور کس پر نہ اتاریں۔

قاری کا مشاہدہ انسان کی تخلیق اللہ تعالیٰ نے کی ہے وہی انسان کا واحد خالق اور معبود ہے انسان کے ہر ہر حال سے وہ واقف ہے۔ قرآن شریف میں ہمیں یہ بات ملتی ہے کہ :

وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ ۝

اور ہم انسان کی رگِ گردن سے بھی زیادہ قریب ہیں۔

(سورہ قٓ : ۱۶)

سورۂ یونس میں ارشاد فرمایا گیا کہ:

وَمَا تَكُوْنُ فِيْ شَاْنٍ وَّمَا تَتْلُوْا مِنْهُ مِنْ قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ط وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ

چاہے تم جس حال میں ہوتے ہو تو ہمارے علم میں ہوتے ہو کیا کر رہے ہو اور کس کام میں مشغول ہو اور جب قرآن مجید میں سے کچھ پڑھتے ہو اور اس پر کوئی عمل کرتے ہو تو اس مخصوص موقع پر ہم تمہارا مشاہدہ کرتے ہیں۔ جب تم اس کام کو شروع کرتے ہو تو ہم تمہیں اپنے مشاہدہ میں لئے ہوتے ہیں اور تمہارے

مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ اِلَّا فِيْ	پروردگار کی نگاہ سے کوئی ذرّہ برابر بھی
كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ۝	چیز زمین میں اور آسمان میں چھپی ہوئی
(سورہ یونس - ۶۱)	نہیں ہے بلکہ ذرّہ سے بھی کوئی چھوٹی

چیز ہو یا بڑی چیز ہو تو اس کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی یہ سب کتابِ مبین میں اللہ نے درج کر دیا ہے۔

اس آیت میں قرآن شریف پڑھنے والوں کی شان بیان کی گئی ہے۔ ان کا مرتبہ بتایا گیا ہے کہ جب وہ قرآن مجید پڑھتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کے مشاہدے میں ہوتے ہیں ۔ کوئی شخصیت ہو، قوم ہو یا خاندان ہو یا کوئی گھرانہ ہو اور وہ قرآن مجید پڑھتا ہے تو جس وقت کلام الٰہی کی تلاوت شروع کی جاتی ہے تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے ان پر رحمت کا گھیرا ڈال دیتے ہیں اور تلاوت کے موقع پر جو کچھ بھی آدمی پڑھتا ہے وہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں۔ ایک بات تو یہ بتائی گئی ۔

ایک اور بات یہ بتائی گئی کہ خود اللہ تعالیٰ مشاہدہ کرتا ہے ہر اس شخص کا جو قرآن شریف پڑھ رہا ہو۔ معنیٰ اس کے یہ ہوئے کہ اگر کوئی قوم اور ملّت اللہ کی کتاب کی حامل ہو جاتی ہے تو آپ سے آپ اللہ کے مشاہدہ میں ہے اور جو اللہ کے مشاہدہ میں ہے وہ اس کی حفاظت میں بھی ہے۔

اس مضمون کی ایک اور آیت اپنے ذہن میں رکھئے کہ :

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝ لَّا	یہی وہ غلبہ والی کتاب ہے کہ جس میں
يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ	نہ باطل ادھر سے آسکا نہ ادھر سے اور
يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ ؕ	یہ ایک حکیم یعنی دانشمند اور دانا کی طرف
تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ۝	سے اور حمید یعنی تعریف کے مستحق مالک
(حٰمٓ السجدہ : ۴۲-۴۱)	کی طرف سے نازل فرمایا گیا ۔

یہ آیتِ شریفہ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ کوئی فرد یا قوم دنیا میں غلبہ حاصل کرنا چاہے اور عزّت حاصل کرنا چاہے تو کتاب اللہ کا حامل ہو جائے ۔ خدا کی کتاب کو اگر کوئی بھی اٹھالے تو وہ غالب ہوگا۔

اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ	اگر اللہ تمہاری مدد کرے گا تو تم پر

(سورہ آل عمران ۔ ۱۶) کوئی غالب نہیں آسکے گا ۔

مسلمانوں کو بشارت ہو کہ اس گئے گزرے دور میں بھی انہوں نے اللہ کی کتاب کی حفاظت کی اور اس کو سینوں اور سفینوں میں محفوظ کر رکھا ۔ لاکھوں لاکھ حفاظ آج روئے زمین پر پائے جاتے ہیں جو قرآن مجید کو اپنے سینوں میں محفوظ کئے ہوئے ہیں ۔ نمازوں میں قرآن مجید پڑھا جاتا ہے ۔ کوئی نماز ایسی نہیں کہ جس میں قرآن مجید کا کوئی نہ کوئی حصّہ آدمی پڑھتا نہ ہو ۔ دنیا کی کسی دوسری کتاب کو چاہے وہ آسمانی ہی کیوں نہ ہو یہ حیثیت و فضیلت حاصل نہیں کہ اس کے پڑھنے کو اور اس کی تلاوت کو بندگی کے اندر داخل کیا گیا ہو ۔ یہ فضیلت و معراج تنہا قرآن مجید کو حاصل ہے جو محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے دنیا کے انسانوں کے سامنے پیش کیا گیا ۔

تحفیظ القرآن

اللہ تعالےٰ نے جتنی آسمانی کتابیں قرآن مجید کے پہلے نازل فرمائی تھیں، ان کی حفاظت کا جو اس کا دستور تھا، وہ علاقے کے لحاظ سے، انسانی آبادی کے لحاظ سے اور انسانوں کے ان طبقات کی ضرورت کے لحاظ سے تھا جو اس زمانے میں زندگی گذار رہے تھے، ان کے لئے مقامی ہدایت ناموں کی شکل میں جو کتابیں نازل فرمائی گئیں ۔ ان کے تحفّظ کا انتظام اسی نسبت سے تھا جس نسبت سے اس زمانے کے لوگوں کی ہدایت مقصود رہی ہو لیکن قرآن مجید کا جہاں تک تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے اس کو قیامت تک کے لئے محفوظ کر لیا ہے

سورۂ الحجر میں ارشاد ہے ۔

اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّكۡرَ	اس نصیحت نامہ کو ہم نے نازل فرمایا
وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝	ہے اور اس کی حفاظت ہم خود کریں
(سورہ الحجر ۔ ۹)	گے ــــ !!

یوں تو اللہ تعالیٰ نے جو بات اپنے ذمّہ لے رکھی ہے حفاظت کی وہ اب تک الحمد للہ برابر ہو رہی ہے کوئی شخص قرآن مجید کو مانے یا نہ مانے اس پر ایمان لائے یا نہ لائے ۔ اس کی ذمّہ داری اور ثواب و عذاب اسی کے سر ہے لیکن جہاں تک اس کتاب کے محفوظ ہونے کا تعلق ہے اس میں کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا کہ قرآن شریف الحمد للہ جوں کا توں محفوظ ہے جیسے اسے محمد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم

نے انسانوں کے سامنے پیش فرمایا تھا۔ قرآن مجید کی تمام تر سورتیں یکے بعد دیگرے محفوظ ہیں، کسی لفظ، حرف، یا شوشہ کی تبدیلی آج تک اس میں نہ ہو سکی اور نہ انشاء اللہ ہو گی۔ اسی طرح جہاں تک ذکر کا تعلق ہے یعنی یاد دہانی اور محفوظیت کا اور چرچے میں آنے کا تو فرمایا کہ:

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ۝	ہم نے اس قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے آسان کر دیا تو ہے کوئی جو اس نصیحت کو حاصل کرے۔
(سورہ القمر۔ ۱۷)	

اسی طریقہ سے یہ بھی ارشاد ہوا۔

بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ ؕ	بلکہ یہ روشن آیتیں ہیں جو اہل علم کے سینوں کے اندر محفوظ ہیں۔
(سورۃ العنکبوت ۔ ۴۹)	

اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کی انسانوں کے اس گروہ کے ذریعہ حفاظت کی جن کو فرمایا کہ:

كِرَامٍۢ بَرَرَةٍ	نیکوکار اور اکرام والے لوگ
(سورہ عبس ۔ ۱۶)	

جنہوں نے ایک طرف تو قرآن شریف کو لکھ کر محفوظ کیا اور دوسری طرف اپنی یاد دہانی اور تحفیظ میں اسے سمو لیا۔ کیا دنیا کی کسی کتاب کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ وہ لفظ بلفظ لاکھوں لاکھ انسانوں کو یاد ہو۔ سال میں ایک مہینہ جو رمضان شریف کا ہمارے یہاں آتا ہے، ہر سال لاکھوں لوگ محراب مسجد میں کھڑے کھڑے پوری کتاب ایک ماہ میں سنا دیں اور کروڑوں لوگ، صف باندھ کر باادب اجتماعی طور پر اسے سنتے ہوں۔

خود ہمارے ملک ہندوستان میں ۷ لاکھ سے اوپر مساجد ہیں۔ ان میں کچھ کو چھوڑ کر تقریباً سب جگہ الحمد للہ تراویح کا نظام قائم ہے اور وہ لوگ جو نہ کسی سلطنت کی مدد لیتے ہیں اور نہ کسی کے سہارے جیتے ہیں، محض اللہ کے نام پر زندگی گذارتے ہیں، انہیں قرآن شریف ازبر یاد ہے جنہیں ہم حفاظ کہتے ہیں۔ کھڑے کھڑے ۲۷ دن میں کوئی ۳۰ دن میں یعنی ایک مہینہ میں قرآن شریف محراب میں سنا دیتے

(بقیہ صفحہ ۱۶ پر)

انسانی تعلیم و تربیت کے قرآنی مقاصد

یہ مقالہ ڈاکٹر سلیم فارانی صاحب نے محاضراتِ قرآنی کے اجلاس منعقدہ اکتوبر ۸۳ء میں پیش فرمایا

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم، بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

اس وقت موضوع مقالہ ہے انسانی تعلیم و تربیت کے قرآنی مقاصد

قرآن حکیم اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمام انسانوں کے لئے کتابِ ہدایت ہے۔ یعنی عالم انسانی کے لئے ہدایتِ ربّانی کا ماخذ ہے۔ فِیْهِ هُدًی لِّلنَّاسِ۔ مَا هُوَ اِلَّا ذِکْرٌ لِّلْعَالَمِیْنَ۔

یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اب دُنیا میں ہدایت ربّانی کا صرف یہی ایک ماخذ صحیح و سالم اور اصلی حالت میں، بے تحریف موجود ہے۔ کیونکہ ہدایتِ انسانی کے لئے ظہورِ آدم کے روزِ اوّل سے لے کر نزولِ قرآنِ حکیم تک، جو کتُبِ ہدایت یا صحائفِ آسمانی نازل ہوتے رہے، وہ سب یا تو بالکل ناپید ہو چکے ہیں۔ یا اگر کہیں کسی صورت میں موجود ہیں بھی تو وہ ناقص، نامکمل، محرّف اور ناقابلِ اعتماد حالت میں ہیں، اس لحاظ سے تمام عالمِ انسانی کیلئے ہدایتِ ربّانی حاصل کرنے کا اگر کوئی صحیح و سالم، قابلِ اعتماد ذریعہ اب دُنیا میں موجود ہے تو وہ صرف اور صرف قرآنِ حکیم ہے — یہ ایک ایسی حقیقت ہے، جسے تسلیم کرنے پر اب ساری دُنیا کے انسان مجبور ہیں۔

اس حقیقت کی بنا پر حق یہ ہے کہ ہدایتِ ربّانی کے طلبگار اپنی زندگی کی ہر

سطح اور ہر پہلو کے ہر عمل میں قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع کریں - اور اسی کے مطابق اپنی زندگی کے تمام نظامات کی تشکیل کریں -

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خوشگواری اور ترقی کے لئے، ہر انسان کی تعلیم و تربیت لازمی ہے - اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تعلیم و تربیت ہی کے ذریعے انسان کو اپنی زندگی کی ہر سطح اور ہر پہلو کے ہر عمل کے طریقے کا علم میسر آتا ہے - یہی علم ناقص یا معیوب ہو اور امکانِ سہو و خطا سے محفوظ نہ ہو، تو ظاہر ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی حقیقی خوشگواری اور ترقی ممکن نہیں -

انسانی زندگی کے لئے امکانِ سہو و خطا سے محفوظ، بے عیب، صحیح اور مکمل علم فکرِ انسانی کے نتائج سے میسّر نہیں آسکتا - اس کا اصل ذریعہ ہدایتِ ربانی ہے - اور یہ ہدایتِ ربانی — جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا — اب دُنیا میں صرف اور صرف قرآنِ حکیم کی صورت میں صحیح و سالم، اصل حالت میں موجود ہے، اور اب اگر دُنیا کے انسانوں کو اپنی زندگی کے لئے ہدایتِ ربانی مطلوب ہے تو اس کے لئے قرآنِ حکیم کی طرف رجوع کیے بغیر چارہ نہیں

حق یہ ہے کہ انسانی زندگی کی تمام سطحوں کے تمام پہلوؤں کے لئے لائحۂ عمل قرآنِ حکیم ہی کی روشنی میں تیار کیا جائے - اور انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں میں انسان کی تعلیم و تربیت کا محور قرآنِ حکیم ہی کو بنایا جائے -

ظاہر ہے کہ جو لوگ قرآنِ حکیم کے عقیدت کیش نہیں بلکہ اس کے مخالف ہیں وہ تو اپنے تعصّب کی بنا پر اسے انسانی تعلیم و تربیت کا محور بنانے میں تامل کریں گے -

لیکن یہ تو انصاف کا تقاضا ہے کہ قرآنِ حکیم کے عقیدت کیشوں کو اس میں قطعاً تامّل نہیں ہونا چاہیئے -

چنانچہ قرآنِ حکیم کے عقیدت کیشوں سے اس التماس پر اصرار کرنا بے جا نہ ہوگا کہ اغیار کی تقلید میں بھٹکنے کے بجائے قرآنِ حکیم کو اپنے نظامِ تعلیم کا محور بنائیں اُنھیں اس امر کا احساس ہونا چاہیئے کہ ان کی زندگی کی تمام پریشانیوں اور

موجودہ مسائل کا باعث اغیار کی تقلید اور انسانی فکر کے زائیدہ اسالیبِ عمل و ترتیب کا استعمال ہے۔

قرآنِ حکیم کو تعلیم و تربیت کا محور بنانے سے وہ تمام مسائل نہایت خوش اسلوبی سے حل ہو جائیں گے، جو آج ہر سطحِ زندگی پر معاشرے کے لئے اضطراب کا سبب بن رہے ہیں: مثلاً:

نژادِ نو کی بے رہروی کا مسئلہ
معاشرے میں بدنظمی اور انتشار کا مسئلہ
عام انسان کے اخلاقی انحطاط اور زوال کا مسئلہ
مُعلّم کے عدمِ اخلاص اور فرائض سے کوتاہی کا مسئلہ
مُتعلّم کی بے توجہی اور علمی شغف سے گریز کا مسئلہ
تعلیم بالغاں اور تعلیم نسواں کا مسئلہ
امتحانات میں خیانت کا مسئلہ
بدعنوانیوں اور دھاندلیوں کا مسئلہ
معاشرتی اضطرار و اضطراب کا مسئلہ
معاش و معیشت میں فریب کاریوں کا مسئلہ
انتظام و سیاست میں ناروا جلبِ منفعت کا مسئلہ
تحفظ اور دفاع کا مسئلہ
منافقت اور تخریب کاری کے انسداد کا مسئلہ
امن و امان کا مسئلہ
بین اقوامی وقار کا مسئلہ ——— وغیرہ وغیرہ

مفکرینِ عالم کا اس امر پر اتفاق ہے کہ نظامِ تعلیم کی کیفیت کے ساتھ قوموں کے افراد کی انفرادی اور اجتماعی پہلوؤں کے معیارِ کیفیت کا گہرا تعلق ہے:۔

چنانچہ سب محسوس کرتے ہیں کہ انسانی زندگی سے اس ہمہ گیر ربط کے لحاظ سے نظامِ تعلیم کا جو تقدس اور احترام ہونا چاہیئے، وہ اسے نصیب نہیں۔ اسی احترام و تقدس سے محرومی کی بنا پر یہ صورتِ حال ہے کہ عالمی سطح پر نظاماتِ

تعلیم کے سلسلے میں مختلف النوع ترقیوں کے باوجود انسانیت عظمیٰ میں خوشگواری کی استواری کے بجائے ہمہ گیر انحطاط ہوتا چلا جا رہا ہے۔

اس احترام و تقدّس کے فقدان کا اصل سبب یہ ہے کہ نظامِ تعلیم کا محور فکرِ انسانی بنا ہوا ہے اور فکرِ انسانی میں روز بروز تغیر و تبدل ہونے کے علاوہ احساسِ نقص احتمالِ سہو و خطا کی بنا پر اس پر اعتماد استوار نہیں ہو رہا بلکہ مختلف افکار کے تصادم اور ٹکراؤ کے باعث مسلسل متزلزل رہتا ہے۔

قرآن حکیم کو محورِ تعلیم بنانے سے اساسی طور پر اس امر کا امکان تو پیدا ہو جائے گا کہ قرآنِ حکیم کی نسبت سے نظامِ تعلیم کو بھی تقدس و احترام حاصل ہو جائے گا پھر اسی نسبت سے رفتہ رفتہ ان تمام مسائل کے حل ہونے کی صورت بھی پیدا ہو جائے، جن کی طرف پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے۔

جس طرح ایک نمازی نماز کے تقدس و احترام کے زیرِ اثر تکبیر تحریمہ کے بعد یکسو ہو کر اپنے آپ پر اِدھر اُدھر دیکھنا اور بے جا حرکات کرنا حرام کر دیتا ہے اور مقررہ ارکانِ نماز، تسبیحات و کلمات میں ایسا محو و مستغرق ہو جاتا ہے کہ کسی قسم کا کوئی محرک اِسے اس استغراق سے منفص نہیں کر سکتا۔ اور جس طرح وہ نماز کے لئے طہارت، وضو، پاکیزگی لباس، احترامِ مسجد و جائے نماز اتحادِ عمل، اطاعتِ امام، شور و غل سے احتراز وغیرہ کے آداب کی پابندی ملحوظ رکھتا ہے۔ اور یہ مزید حُسن اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے اُسی طرح قرآن حکیم کی ہدایت کے مطابق نظامِ تعلیم کی تشکیل سے قرآنی تقدس کی نسبت سے تعلیمی حلقے کے اخلاقی انحطاط کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اور عدمِ اخلاص و بے توجہی وغیرہ کی شکایات بھی دور ہو جائیں گی۔

قرآنِ حکیم کو نظامِ تعلیم کا محور بنانے کا مقصود یہ نہیں کہ قرآن خوانی کیلئے ناظرہ قرآن خوانی، قرأت و تجوید، حفظ وغیرہ اور قرآن فہمی کے لئے اس کے آلی علوم یعنی لسانی صرف و نحو، ترجمے، مخصوص نظریات کی متداول تفاسیر، مناظروں کی خاطر منطق و فلسفہ اور مخصوص مسلک کی فقہی کُتب کو نظامِ تعلیم کے نصاب میں شامل کر دیا جائے اور اس سے انسان کو مخصوص و معین مسلک

کا متعصب اور تفرقہ افروز مناظر بنا دیا جائے۔

بلکہ مقصود یہ ہے کہ قرآن کی روشنی میں انسان کو اُس طرح کا عملی و صحیح انسان بنانے کا اہتمام کیا جائے۔ جس طرح کا انسان اُسے قرآن حکیم بنانا چاہتا ہے۔ آیئے اب دیکھیں کہ قرآن حکیم کس قسم کا انسان بنانا چاہتا ہے۔ یا انسان کی تعلیم و تربیت کے قرآنی مقاصد کیا ہیں؟

۱۔ قرآن حکیم چاہتا ہے کہ انسان کی تربیت اس طرح ہو کہ وہ زندگی بھر یکسو ہو کر رہے، تاکہ فکری اور عملی انتشار سے بچا رہے — وہ اِلٰہ واحد کا مخلص بندہ ہو کر رہے اور ادھر اُدھر بھٹکنے سے باز رہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ۔ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ قرآن حکیم چاہتا ہے کہ انسان ایک متعین نصب العین کی خاطر زندگی بسر کرے اور یہ متعین نصب العین، رضائے الٰہی ہو۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ۔

۳۔ قرآن حکیم چاہتا ہے کہ انسان اس منصب و مقام کو مدنظر رکھ کر زندگی بسر کرے جس کے لئے خدا نے اُسے پیدا کیا ہے۔ اُسے خدا نے خلیفۃ اللہ فی الارض کا منصب دیا ہے۔ اِنِّيْ جَاعِلٌ فِي الْاَرْضِ خَلِيْفَةً اُسے اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کرنا ہے کہ وہ اس منصب کا مستحق ہے۔ اور اس سلسلے میں اُسے اپنے اُس دشمن ابلیس کا مقابلہ کرنا ہے، جو اسے ہر طرح اس منصب کے لئے نااہل ثابت کرنے کے لئے تخلیق انسان کے وقت ہی سے قسم کھا چکا ہے۔

خلیفۃ اللہ فی الارض ہونے کی حیثیت سے اُسے حسب ارشاد وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ایک طرف زمین میں مستقر یعنی معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور اخلاقی۔ اور دوسری طرف متاع۔ یعنی معاش و معیشت اور اقتصادیات کے لحاظ سے نظام حق و عدل قائم کر کے دکھانا ہے۔

۴۔ قرآن حکیم چاہتا ہے کہ انسان زندگی میں اپنا ہر عمل ذمہ داری اور محاسبہ کے یقینی احساس کے ساتھ انجام دے۔ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ

كُلُّ أُولٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا

۵ - قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان کو جو کچھ دُنیاوی زندگی میں ملا ہے یا ملتا ہے، اُسے خدا کی طرف سے امانت سمجھے اور اس کے استعمال میں غلط روش سے اجتناب کرے اور احتیاط سے کام لے۔

۶ - قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان اپنے ہر عمل میں مکمل اور مربوط زندگی (دنیاوی و اخروی) کو سامنے رکھے تاکہ صرف دنیاوی زندگی میں مستغرق ہو کر اُخروی زندگی سے بے نیاز نہ ہونے پائے اور دنیا میں بھی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ایک مکمل مربوط نظام کو مدنظر رکھے اسکے تمام اجزا کو باہم مربوط سمجھے اور خیال رکھے کہ اُس کے عمل سے اس زندگی کا کوئی ایک شعبہ دوسرے سے متصادم نہ ہونے پائے۔

۷ - قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان دُنیاوی عرصۂ حیات کو اور اس میں ہر کیفیت و عطا کو آزمائش سمجھے اور کسی چیز اور کیفیت سے فریب نہ کھائے۔ یہاں کی عزت، خوشی اس بات کی دلیل ہیں کہ انسان خدا کا مقبول ہو گیا ہے۔ اور تکلیف اس بات کی دلیل کہ انسان خدا کے نزدیک معتوب ہو گیا ہے۔

۸ - قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان تفقہ فی الدین حاصل کرے یعنی اپنے لئے خدا کی طرف سے مقررہ نظامِ حیات کو سمجھے اور اس میں ایسی بصیرت حاصل کرے کہ ہر عمل کے وقت صواب و ناصواب خود بخود سوجھتا جائے اس کا ضمیر گواہی دے اور اسکی باطنی قوت اسے اطمینان کی راہ دکھائے۔

۹ - قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی جرأت اور ہمت و استعداد پیدا ہو۔

۱۰ - قرآنِ حکیم چاہتا ہے کہ انسان جہاد اور اجتہاد میں اعتدال و توازن کی زندگی بسر کرے۔ اور جمود و تقلید میں غیر معتدل اور غیر متوازن انداز میں دنیا سے منقطع ہو کر اپنے فرائض سے گریز کر کے گوشہ نشینی اختیار نہ کرے بلکہ بھری اجتماعی زندگی میں عادلانہ روش دکھائے۔

تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ

ان دس نکات میں انسانی تعلیم و تربیت کے قرآنی مقاصد کو اضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر بغور سمجھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہی واضح مقاصد کے پیش نظر تعلیم و تربیت لینے والے افراد اور معاشرے کے لئے فرمایا گیا ہے کہ:

فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ، فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ

یعنی وہ ہر قسم کے فساد سے محفوظ رہیں گے۔

ان مقاصد کی رُو سے قرآن حکیم نے جو لائحۂ عمل بتایا ہے وہ اچھی خاصی تفصیلات پر مشتمل ہے۔ لیکن وہ طویل بحث اس نشست میں ممکن نہیں۔ ان مقاصد کے پیش نظر جائزہ لینا چاہیئے کہ ہمارے مروج دینی یا دنیاوی نظاماتِ تعلیم انسانوں کے لئے ہر قسم کی تعلیم و تربیت مہیا کر رہے ہیں یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ نہیں کر رہے۔ اگر کر رہے ہوتے تو اس قسم کا فساد روما نہ ہوتا جس سے انسانی افراد اور معاشرہ دونوں آج دوچار ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے نظام تعلیم و تربیت کی سمت درست کر سکیں اور اپنے تعلیمی اداروں سے علمی بھرتی کے انسان تیار کرنے کے بجائے قرآنی مقاصد کے مطابق صحیح قسم کے عملی انسان تیار کر کے اس قسم کا خوف و حزن سے پاک معاشرہ تعمیر کریں۔ جو اسلام اور اُس کی کتابِ ہدایت، قرآن حکیم کا مقصود ہے۔

واللہ المستعان

قارئین حکمتِ قرآن سے گزارش!

صفحات نیز طباعتی امور (کتابت، طباعت، کاغذ) میں ہوش ربا اضافہ کے باعث مجبوراً ادارہ حکمتِ قرآن کے زرِ تعاون اور فی نسخہ میں اس ماہ سے اضافہ کیا جا رہا ہے۔ مارچ ۸۴ء سے سالانہ زرِ تعاون کی رقم تیس روپے اور ایک نسخے کی قیمت تین روپے ہوگی۔ اطلاعاً عرض ہے۔ نوٹ فرمالیں!!

(ادارہ)

سائنس کا روحانی پہلو قرآن حکیم کی روشنی میں

یہ مقالہ چوہدری مظفر حسین صاحب نے محاضرات قرآنی کے اجلاس منعقدہ اکتوبر ۱۹۸۳ء میں پیش فرمایا

اسلام میں رُوحانیت کا واحد معیار "خداشعوری" ہے۔ چنانچہ جو بھی فکر یا عمل "خداشعوری" کی اساس سے محروم ہو یا خداشعوری کو ترقی نہ دے وہ اسلامی نقطۂ نظر سے رُوحانیت سے عاری قرار پائے گا۔ قرآن حکیم نے شروع میں ہی اس بات کی وضاحت کر دی ہے کہ اس سے صرف متقی لوگ ہی ہدایت پا سکتے ہیں لفظ "متقی" کے انگریزی ترجمہ کے لئے علامہ محمد اسد نے اپنی تفسیر The Message of Quran میں God-conscious کا لفظ استعمال کیا ہے اور اس لفظ کے انتخاب کا نہایت عمدہ جواز پیش کیا ہے وہ فرماتے ہیں :-

The conventional translation of "mutta qi" as "God fearing" does not adequately render the positive content of this expression - namely, the awareness of His presence; and the desire to mould one's existence in the light of this awareness; while the interpretation adopted

by some translators "One who guards himself against evil" or "One who is careful of his duty" does not give more than one particular aspect of God-consciousness."

اس اعتبار سے ہمارے نزدیک "تقویٰ" قرآن حکیم کی بنیادی روحانی اصطلاح ہے۔ روحانی الذہن ہونے کے لئے خداشعوری لازم ہے اور قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے روحانی الذہن ہونا ایک لازمی شرط۔

ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ فِيْهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ

(یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے)

سورہ محمد کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت ایک ترقی پذیر عمل ہے جس کا آخری ثمرہ بھی "تقویٰ" ہی ہے جو ہر ہدایت یافتہ شخص کی استعداد اور عمل کے مطابق اُسے عطا کیا جاتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّاٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ

(اور جن لوگوں نے ہدایت پائی، اللہ تعالےٰ انہیں اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصّے کا تقویٰ عطا کرتا ہے)۔

امام راغب کے نزدیک تقویٰ کے بے شمار مدارج ہیں اور مختلف آیات میں ہر جگہ تقویٰ ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مختلف روحانی مدارج کے لئے قرآن حکیم نے اگر کوئی ایک ہی جامع اصطلاح استعمال کی ہے تو وہ "تقویٰ" ہے اور "تقویٰ" کے ان بے شمار مدارج میں سے ایک درجہ ایسا ہے جو اس کائنات کے مشاہدے اور اس کے نظامِ تخلیق میں غور و خوض کر کے اللہ تعالےٰ کی حکمت اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے!

اِنَّ فِيْ اخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَّقُوْنَ

(یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔)

اس آیت کی رُو سے قرآن حکیم نے رُوحانی تربیت کے لئے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ اس کائنات میں اللہ تعالےٰ کی پیدا کردہ تمام چیزوں کا کھلی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ اس انداز سے کریں کہ ان سے جو علم حاصل ہو وہ خُدا کے وجود کی ایک زندہ شہادت بن جائے۔ خود اللہ تعالےٰ نے ایسے اہل علم کی شہادت کو بڑی اہمیت دی ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(اللہ، فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔)

ہماری ناچیز رائے میں "اولو العلم" کے زمرے میں وہ خدا پرست سائنسدان بھی شامل ہیں جن کے نزدیک سائنس کا وظیفہ شہادتِ توحید ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر سائنس اس وظیفہ کو صحیح طریقے پر انجام دینے لگے تو یہ اسلامی معاشرے میں ان تمام رُوحانی فضائل کی تخلیق کا باعث بن سکتی ہے جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے عین مطلوب ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے لفظ 'ہدایت' ہی کو لیجئے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لفظ ہدایت کے مفہوم کی تشریح میں "بصیرت" اور "قلبی نور" کو سرفہرست رکھا ہے اور سائنس کی ساری تگ و دو بھی تو اس لئے ہے کہ مظاہرِ فطرت کا مطالعہ کر کے قوانینِ فطرت میں بصیرت حاصل کی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ الحاد اور لادینیت کے موجودہ دور میں سائنس اپنی اُس حقیقی منزل سے غافل بلکہ سرے سے ہی منکر ہو گئی ہے جو قرآن کے نزدیک اس کی اصل منزل ہے یعنی خدا شناسی اور خدا یابی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہدایت کے لفظ میں بصیرت کا مفہوم

by some translators "One who guards himself against evil" or "One who is careful of his duty" does not give more than one particular aspect of God-consciousness."

اس اعتبار سے ہمارے نزدیک "تقویٰ" قرآن حکیم کی بنیادی روحانی اصطلاح ہے۔ روحانی الذہن ہونے کے لئے خداشعوری لازم ہے اور قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے روحانی الذہن ہونا ایک لازمی شرط۔

ذَالِكَ الْكِتَابُ لَارَيْبَ فِيهِ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ

(یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس میں کوئی شک نہیں، ہدایت ہے متقی لوگوں کے لئے)

سورہ محمد کی ایک آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت ایک ترقی پذیر عمل ہے جس کا آخری ثمرہ بھی "تقویٰ" ہی ہے جو ہر ہدایت یافتہ شخص کی استعداد اور عمل کے مطابق اُسے عطا کیا جاتا ہے۔

وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ

(اور جن لوگوں نے ہدایت پائی، اللہ تعالےٰ انہیں اور زیادہ ہدایت دیتا ہے اور انہیں ان کے حصّے کا تقویٰ عطا کرتا ہے)۔

امام راغب کے نزدیک تقویٰ کے بے شمار مدارج ہیں اور مختلف آیات میں ہر جگہ تقویٰ ایک خاص معنی رکھتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں مختلف روحانی مدارج کے لئے قرآن حکیم نے اگر کوئی ایک ہی جامع اصطلاح استعمال کی ہے تو وہ "تقویٰ" ہے اور "تقویٰ" کے ان بے شمار مدارج میں سے ایک درجہ ایسا ہے جو اس کائنات کے مشاہدے اور اس کے نظامِ تخلیق میں غور و خوض کر کے اللہ تعالےٰ کی حکمت اور قدرت کی نشانیاں دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے!

إِنَّ فِي اخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ اللَّهُ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَتَّقُونَ

(یقیناً رات اور دن کے الٹ پھیر میں اور ہر اس چیز میں جو اللہ نے آسمانوں اور زمین میں پیدا کی ہے نشانیاں ہیں ان لوگوں کیلئے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔)

اس آیت کی رُو سے قرآن حکیم نے رُوحانی تربیت کے لئے یہ لازمی قرار دیا ہے کہ وہ اس کائنات میں اللہ تعالےٰ کی پیدا کردہ تمام چیزوں کا کھلی آنکھوں کے ساتھ مشاہدہ اور مطالعہ اس انداز سے کریں کہ ان سے جو علم حاصل ہو وہ خُدا کے وجود کی ایک زندہ شہادت بن جائے۔ خود اللہ تعالےٰ نے ایسے اہل علم کی شہادت کو بڑی اہمیت دی ہے:

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝

(اللہ، فرشتوں اور اہل علم کی گواہی ہے کہ اُس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وُہ غالب اور حکمت والا ہے۔)

ہماری ناچیز رائے میں "اولوا العلم" کے زمرے میں وُہ خدا پرست سائنسدان بھی شامل ہیں جن کے نزدیک سائنس کا وظیفہ شہادتِ توحید ہے۔

قرآن حکیم کی تعلیمات کی روشنی میں یہ بات پورے وثوق کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ اگر سائنس اس وظیفہ کو صحیح طریقے پر انجام دینے لگے تو یہ اسلامی معاشرے میں ان تمام رُوحانی فضائل کی تخلیق کا باعث بن سکتی ہے جو اسلامی نقطۂ نگاہ سے عین مطلوب ہیں۔ مثلاً سب سے پہلے لفظ "ہدایت" ہی کو لیجئے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے لفظ ہدایت کے مفہوم کی تشریح میں "بصیرت" اور "قلبی نور" کو سرفہرست رکھا ہے اور سائنس کی ساری تگ و دو بھی تو اس لئے ہے کہ مظاہرِ فطرت کا مطالعہ کر کے قوانینِ فطرت میں بصیرت حاصل کی جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ الحاد اور لادینیت کے موجودہ دور میں سائنس اپنی اُس حقیقی منزل سے غافل بلکہ سرے سے ہی منکر ہو گئی ہے جو قرآن کے نزدیک اس کی اصل منزل ہے یعنی خدا شناسی اور خدا یابی۔ اور یہی وجہ ہے کہ اگرچہ ہدایت کے لفظ میں بصیرت کا مفہوم

بھی شامل ہے لیکن قرآن حکیم نری بصیرت اور ہدایت بمعنی بصیرت میں واضح فرق کرتے ہوئے ہدایت کا لفظ صرف اُسی بصیرت کے ساتھ مخصوص کرتا ہے جو انسان کو خدا پر یقین کی منزل تک پہنچائے - قرآن حکیم کا اپنے بارے میں یہ دعوے نہایت معنی خیز ہے کہ اس کی عطا کردہ بصیرت عام لوگوں کے لئے بھی ہے اور خاص لوگوں کے لئے بھی -

هٰذَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ

(یہ بصیرت کی روشنیاں ہیں سب لوگوں کے لئے اور ہدایت اور رحمت ان لوگوں کے لئے جو یقین لائیں -)

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن حکیم جب بھی مظاہر فطرت کو لوگوں کے سامنے خدا کی نشانیوں کے طور پر پیش کرتا ہے تو ایک طرف وُہ انہیں لِقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ، لِقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ، لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ، لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ کے ناموں سے خطاب کرتا ہے جو عام انسانی فضائل سے تعلق رکھتے ہیں اور دوسری طرف وہ ان کے لئے لِقَوْمٍ يَّشْكُرُوْنَ، لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ، لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ، لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ وغیرہ خطابات سے پکارتا ہے جو خالص رُوحانی فضائل شمار کئے جاتے ہیں - گویا قرآن حکیم اس حقیقت کو ذہن نشین کروانا چاہتا ہے کہ مظاہر کائنات کا مشاہدہ اور ان میں تعقل، تفکر، تفقہ بھی بصیرت افروز ہیں لیکن اس طرح سے جو بصیرت حاصل ہوتی ہے وُہ "ہدایت" اور "رحمت" صرف اُسی صورت میں بن پائے گی جب اس بصیرت سے انسان کے اندر تقویٰ، ایمان، اسلام، تشکر اور تذکر کے رُوحانی داعیات بیدار ہوں گے - اس کے علاوہ اس کا ایک مطلب یہ بھی لیا جا سکتا ہے کہ قرآن جس قسم کی صفات رکھنے والا انسان پیدا کرنا چاہتا ہے اس میں تقویٰ ایمان، اسلام، تشکر اور تذکر جیسے فضائل کے علاوہ تفکر، تعقل اور تفقہ جیسے فضائل کا پایا جانا بھی ویسا ہی ضروری ہے - یہ فضائل ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح سے مربوط اور پیوست ہیں کہ ایک نوع کے فضائل کو دوسری نوع کے فضائل سے الگ کرنے کا تصور

(بقیہ صفحہ ۶۹ پر)

مروجہ نظام زمینداری اور اسلام (۱۰)

مزارعت اور آثارِ صحابہؓ و تابعینؒ

از قلم: مولانا محمد طاسین

حافظ ابن حجرؒ نے اس عبارت میں علامہ قابسیؒ کے اعتراض کا جو جواب دیا ہے میں سمجھتا ہوں کچھ زیادہ اطمینان بخش نہیں کیونکہ علامہ قابسیؒ کو اس اثر کا انکار محض اس وجہ سے نہیں کہ اس میں قیس بن مسلم متفرد ہیں بلکہ اس وجہ سے ہے کہ ابوجعفر مدنی سے اس کو کوئی مدنی راوی روایت نہیں کرتا بلکہ ایک کوفی راوی ہی روایت کرتا ہے قابسی کی اس اصل بات کا عبارتِ مذکور میں کوئی جواب نہیں۔ رہی یہ بات کہ ثقہ راوی کا کسی روایت میں متفرد و منفرد ہونا روایت کے لئے مضر نہیں ہوتا تو یہ اس صورت میں ضرور صحیح ہوتی ہے جب اس کے خلاف دوسرے ثقہ راویوں کی روایات اور ایسی وجوہات موجود نہ ہوں جو اس کو مشکوک و مشتبہ بنا دیتی ہوں، اور یہاں ایسی روایات اور وجوہات موجود ہیں۔ اور پھر حافظ ابن حجر نے اسماء الرجال سے متعلق اپنی عظیم کتاب تہذیب التہذیب میں ان لوگوں کے اندر قیس بن مسلم کا شمار اور ذکر نہیں کیا جنہوں نے ابوجعفر الباقر محمد بن علی سے احادیث روایت کی ہیں، اسی طرح قیس بن مسلم کے ترجمہ میں ان شیوخ کے اندر ابوجعفر الباقر کا نام نہیں ذکر کیا جن سے قیس بن مسلم نے روایات لی ہیں، یہ چیز بھی ابوجعفر سے قیس بن مسلم کے سماع کو مشکوک بنا دیتی ہے۔

حافظ ابن حجر کے جواب مذکور میں یہ بھی فرمایا گیا ہے:۔

"والواقع ان قیسا لم ینفرد بہ فقد وافقہ غیرہ فی بعض معناہ کما سیأتی قریبًا"

مطلب یہ کہ قیس بن مسلم اس روایت میں تنہا نہیں بلکہ بعض دوسرے راویوں نے بھی کچھ کچھ یہی بات روایت کی ہے۔ لہٰذا اس سے بھی قیس بن مسلم کی روایت میں کچھ قوت پیدا ہو جاتی ہے، وہ دوسری روایت جو ان کے فرمانے کے مطابق عنقریب آگے آرہی

ہے۔ بخاری کے ترجمۃ الباب کی روایت میں سے ایک روایت ہے، جس کی طرف امام بخاری نے صرف یہ لکھ کر اشارہ کیا ہے: "وآل ابی بکر وآل عمر وآل علی" اور حافظ ابن حجر نے اس کی شرح میں لکھا ہے۔

"واما اثر ابی بکر ومن ذکر معھم فروی ابن ابی شیبۃ و عبد الرزاق عن طریق اُخری الی ابی جعفر الباقر انہ سئل عن المزارعۃ بالثلث والربع فقال انی نظرت فی آل ابی بکر وآل عمر وآل علی وجدتھم یفعلون ذٰلک (ص ۸ - ج ۵)

"وہ اثر جو آل ابی بکر سے متعلق ہے ابن ابی شیبہ اور عبد الرزاق نے ایک دوسری سند سے روایت کیا ہے جس کا مضمون یہ ہے کہ حضرت ابو جعفر الباقر سے تہائی اور چوتھائی کے بدلے مزارعت کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے جواب میں فرمایا کہ میں اگر دیکھتا ہوں ابوبکرؓ عمرؓ اور علیؓ کی اولاد کو تو ان کو ایسا ہی کرتے پاتا ہوں۔

عبارتِ مذکور میں علامہ ابنِ حجر نے جس طریقِ اخریٰ کا حوالہ دیا لیکن اسے بیان نہیں کیا وہ مصنف ابن ابی شیبۃ اور مصنف عبد الرزاق میں اس طرح سے ہے۔

حدثنا ابو بکر قال حدثنا ابو اسامۃ و وکیع عن عمرو بن عثمان عن ابی جعفر قال سألتہ عن المزارعۃ بالثلث والربع فقال ان نظرت فی آل ابی بکر وآل عمر وآل علی وجدتھم یفعلون ذٰلک

ابوبکر بن ابی شیبہ نے کہا ہم سے ابو اسامہ اور وکیع نے بیان کیا کہ ان سے عمرو بن عثمان نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے ابو جعفر سے تہائی اور چوتھائی کی مزارعت کے متعلق پوچھا تو انہوں نے جواب دیا کہ اگر میں ابوبکرؓ، عمرؓ اور علی کی آل و اولاد کو دیکھتا ہوں تو ان کو ایسا کرتے پاتا ہوں۔

ص ۳۳۸ - ج ۶

اخبرنا عبد الرزاق قال اخبرنا ابو سفیان قال اخبرنی عمرو بن عثمان بن موھب قال سمعت اباجعفر محمد بن علی یقول آل ابی بکر وآل عمر وآل علی یدفعون ارضھم بالثلث والربع۔

ص ۱۰۱ - ج ۸ - مصنف عبد الرزاق

چونکہ اس اثر کی سند میں ابو جعفر سے روائت کرنے والے راوی کا نام عمر بن عثمان ہے لہٰذا یہ اس اثر سے الگ ہے جس میں ابو جعفر سے روائت کرنے والے قیس بن مسلم ہیں اور پھر چونکہ اس اثر میں صرف مہاجرین کے تین گھرانوں کا ذکر ہے یعنی اولاد ابوبکرؓ اولاد عمرؓ اور اولاد علیؓ کے گھرانوں کا، جبکہ قیس بن مسلم والے اثر میں مہاجرین کے سب گھرانوں کا ذکر ہے۔ لہٰذا اس میں قیس بن مسلم والے اثر کی جزوی اور ادھوری موافقت ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر نے تحریر فرمایا ہے۔

لیکن سوال یہ ہے کہ کیا قیس بن مسلم سے عمرو بن عثمان کی جزوی موافقت سے وہ اصل اعتراض رفع ہو گیا جو علامہ قالبسی نے قیس بن مسلم کے اثر پر کیا ہے؟ جواب یہ ہے کہ وہ رفع نہیں ہوا کیونکہ علامہ قالبسی کے اعتراض و اشکال کی بنیاد یہ نہیں کہ قیس بن مسلم متفرد و منفرد ہیں بلکہ یہ ہے کہ قیس کوفی اور ابو جعفر مدنی ہیں اور کوئی مدنی راوی اس اثر کو ابو جعفر سے روائت نہیں کرتا، اور پھر علامہ قالبسی کا یہی اعتراض اس دوسرے اثر پر بھی وارد ہوتا ہے جس کے راوی ابو جعفر سے عمرو بن عثمان بھی ہیں کیونکہ عمرو بن عثمان بھی مدنی نہیں بلکہ کوفی ہیں جیسا کہ تہذیب التہذیب وغیرہ میں تصریح ہے۔

بہر حال اگر یہ بھی تسلیم کر لیا جائے کہ قیس بن مسلم کا زیر بحث اثر سند و اسناد کے لحاظ سے قابل اعتماد ہے تو درائت کے لحاظ سے اسے قابل اعتبار ثابت کرنا بہت مشکل ہے۔ مثلاً اس پر ایک یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ اس میں یہ جو بات کہی گئی ہے کہ مدینہ میں مہاجرین کا کوئی ایسا گھر نہ تھا جو مزارعت پر زمین کا لین دین نہ کرتا ہو، یہ حقیقت واقعہ اور دوسری بہت سی روایات کے خلاف ہے جن سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مدینہ کے مہاجرین کا معاشی پیشہ اور ذریعۂ معاش تجارت تھا زراعت نہ تھا البتہ انصار کا ذریعۂ معاش زراعت و کھیتی باڑی تھا

اور اگر یہ کہا جائے کہ اس روائت میں جو بات کہی گئی ہے وہ صحابۂ کرامؓ اور عہدِ صحابہؓ سے متعلق نہیں بلکہ ایک صدی گزرنے کے بعد ان کی اولاد سے متعلق ہے جیسا کہ دوسرے اثر میں اس کی وضاحت ہے، یعنی یہ بات درست ہے کہ عہدِ صحابہؓ میں مہاجر صحابۂ کرام کا معاشی مشغلہ تجارت اور انصارِ صحابہؓ کا ذریعہ معاش زراعت و کاشتکاری تھا لیکن ابو جعفرؒ نے جو بات کہی ہے اسکا تعلق صحابۂ کرام کے پوتوں پڑپوتوں سے ہے کیونکہ

خود وہ بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پڑپوتے اور حضرت حسینؓ کے پوتے ہیں اور ۱۲۰ھ میں ان کی وفات ہوئی ہے، لہٰذا ہو سکتا ہے اس وقت مہاجرین صحابہ کرام کی اولاد نے زمینداری اور مزارعت پر زمینیں دینے لینے کا مشغلہ اختیار کر لیا ہو، جس طرح دوسری بہت سی خلافِ شرع چیزیں اس عہد میں رائج ہو گئی تھیں اسی طرح یہ زمینداری بھی رائج ہو گئی ہو، تاریخ بتلاتی ہے کہ ایک صدی بعد اجتماعی طور پر مسلمانوں میں بحیثیت مجموعی نہ وہ سیاسی و معاشی نظام باقی رہا اور نہ وہ معاشرتی و ثقافتی نظام جو عہد رسالت اور عہد صحابہؓ اور خلافت راشدہ میں موجود تھا اور عملی طور پر وہ اجتماعی ڈھانچہ بہت کچھ تبدیل ہو گیا جو عہد رسالت اور عہد صحابہؓ میں اسلامی معاشرے کا تھا اب ایسے افراد بہت کم تھے جن کی زندگیاں کتاب و سنّت کے عین مطابق ہوں اور جو اپنے قول و عمل سے اس اسلام کی صحیح تصویر پیش کر رہے ہوں جو قرآن و سنّت میں اجتماعی زندگی کے متعلق تھا، لہٰذا اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ حضرت ابو جعفر کے زمانہ میں مہاجرین کی اولاد کا مزارعت پر عمل درآمد تھا تو یہ چیز شرعاً مزارعت کے جواز کی دلیل نہیں بن سکتی کیونکہ کسی معاملہ کے جواز و عدم جواز کا اصل دار و مدار کتاب و سنّت اور قرآن و حدیث کے دلائل پر ہے مسلمانوں کا جو تعامل کتاب و سنّت کے مطابق ہو وہ جائز و صحیح اور جو مخالف ہو وہ ناجائز و غیر صحیح قرار پاتا ہے۔ امام مالک اہل مدینہ کے جس تعامل کو اہمیت دیتے ہیں وہ وہ تعامل ہے جس کا سلسلہ صحابہ کرام سے شروع ہوا اور جس کا واضح ثبوت عہد صحابہؓ میں ملتا ہو اور اس کو اہمیت دینے کا مطلب بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ جس مسئلہ کے متعلق روایات کا اختلاف ہو بعض سے اس کا جواز اور بعض سے عدم جواز مفہوم ہوتا ہو تو امام مالک اس روایت یا رائے کو ترجیح دیتے ہیں جو تعامل اہل مدینہ کے مطابق ہو اور یہ اس وجہ سے کہ تعامل صحابہ سے بجا طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ انہوں نے وہ ضرور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی قول و فعل کی بنا پر اختیار کیا ہوگا اور ان کے سامنے ضرور اس عمل کی کوئی سند و دلیل ہوگی اور یہ کہ کسی نظری تعلیم کا جو عملی مطلب صحابہ کرام نے سمجھا وہ بعد والوں کے سمجھے ہوئے مطلب پر یقیناً ترجیح رکھتا اور اقرب الی الصواب ہے لیکن یہ بات صرف اس تعامل مدینہ کی حد تک درست بیٹھتی ہے جس کا سلسلہ بالعموم اور بالاتفاق صحابہ کرامؓ سے شروع ہوا ہو بالفاظِ دیگر مطلب یہ کہ اہل مدینہ کا ایسا تعامل جس کا عہد صحابہؓ میں ثبوت نہ ملتا اور جو عہد صحابہؓ کے بہت بعد وجود میں آیا ہو اور اپنے جواز کے لئے کتاب و سنّت کی کوئی

دلیل و سند نہ رکھتا ہو ایسے تعامل کی شرعاً کوئی حیثیت نہیں ہوتی اور اس کی بنا پر ایک دلیل کو دوسری دلیل پر ترجیح نہیں دی جاتی۔

اور پھر عجیب بات یہ کہ امام مالک جو امام دار الہجرت کہلاتے ہیں مدینہ منورہ میں پیدا ہوئے اور پوری زندگی آخر دم تک مدینہ منورہ میں گزاری اور جن کی وفات ۱۷۹ھ میں ہوئی جبکہ ان کی عمر ایک روائت کے مطابق پچاسی برس اور دوسری روائت کے مطابق نوّے برس تھی گویا ان کی وفات حضرت ابو جعفر کی وفات کے انسٹھ برس بعد ہوئی اور جو ان چند جلیل القدر علماء میں سے ایک اور سرفہرست ہیں جنہوں نے اپنی پوری زندگی کتاب و سنّت کی تعلیم و تدریس اور قرآن و حدیث کی اشاعت و تبلیغ میں صرف کی اور دین اسلام کو سمجھنے سمجھانے میں اپنی سعی و جہد کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا اور مجتہد مطلق کے مقام پر فائز ہوئے، یہ امام مالک جیسا کہ مؤطا اور مدوّنہ سے ظاہر ہوتا ہے معاملہ مزارعت کے عدم جواز کے قائل اور اسے ایک فاسد و باطل معاملہ سمجھتے اور کہتے تھے بشرطیکہ وہ مستقل ہو مساقات کے ضمن میں نہ ہو، یعنی اصل معاملہ تو باغ کا ہو اور اس کے ضمن میں جو تھوڑی سی زمین آجائے جس کی آب پاشی، باغ کی آب پاشی سے خود بخود ہو جاتی ہو، باغ کے تابع ہونے کی وجہ سے اس کا حکم باغ کا حکم ہو جاتا ہے اور باغ کی پیداوار کی تقسیم کی طرح اس کی پیداوار کی تقسیم بھی مالک باغ، اور باغبان کے درمیان جائز ہو جاتی ہے، اور جہاں صرف سادہ زمین ہو اسے مزارعت پر دینا لینا امام مالک کے نزدیک بالکل ناجائز ہے آگے چل کر "ائمہ مجتہدین اور مزارعت" کے باب میں اس پر مفصل بحث آئے گی۔

یہاں اس چیز کے مختصر بیان سے مقصد یہ ظاہر کرنا ہے کہ امام مالک جو تعامل اہل مدینہ کو خاص اہمیت دیتے تھے اگر مزارعت پر اہل مدینہ کا عہد صحابہؓ سے تعامل موجود ہوتا تو وہ کبھی اس معاملہ کو فاسد اور ناجائز نہ کہتے، مطلب یہ کہ ان کا مزارعت کو فاسد و ناجائز معاملہ کہنا اس پر دلالت کرتا ہے کہ اہل مدینہ کا مزارعت پر تعامل نہ تھا لہٰذا اس سے بھی قیس بن مسلم کا زیر بحث اثر مشکوک ہو کر رہ جاتا ہے۔

امام مالک کے نزدیک مزارعت کا معاملہ فاسد و ناجائز معاملہ تھا اس کا اظہار قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج کی اس عبارت سے بھی صاف طور پر ہوتا ہے۔

"سألت امیر المؤمنین عن المزارعة فی الارض البیضاء بالنصف والثلث، فان اصحابنا من اهل الحجاز واهل المدینة علی کراهة

ذلك وانسادہ ، ص ۸۸

ترجمہ: امیرالمومنین آپ نے یہ جو دریافت فرمایا ہے کہ سفید وخالی زمین پر نصف اور تہائی کے بدلے مزارعت کا کیا حکم ہے تو اس کا جواب یہ کہ جہاں تک ہمارے حجاز اور مدینہ کے اصحاب وعلماء وفقہاء کا تعلق ہے ان کا فتویٰ اس کی کراہیت اور انساد پر ہے یعنی وہ اس کے مکروہ اور فاسد ہونے کے قائل ہیں۔

یہاں یہ عرض کر دینا غیر مناسب نہ ہوگا کہ متقدمین کی کتابوں میں "کراہت" کا لفظ عموماً حرمت کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور چونکہ کتاب الخراج کی عبارت مذکور میں "کراہت" کے ساتھ "اِنساد" کا لفظ بھی ہے لہٰذا مطلب یہ بنتا ہے کہ حجاز اور مدینہ کے فقہاء مزارعت کی حرمت پر متفق تھے۔

غرضیکہ اگر قیس بن مسلم کے اثر کو صحیح مان لیا جائے تو اس سے دو باتوں میں سے ایک ضرور ماننی پڑتی ہے یا یہ کہ مزارعت کے متعلق علماء مدینہ کا موقف غلط تھا، یا یہ کہ مزارعت کے بارے میں مہاجرینِ مدینہ کا موقف اور عمل غلط تھا، جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے اسے کوئی سمجھدار انسان نہیں مان سکتا کیونکہ علماء وفقہاء سے زیادہ شریعت کو جاننے اور سمجھنے والا اور کون ہو سکتا ہے لہٰذا ماننا پڑے گا کہ صحابہ کرام کے پوتوں کا عمل مزارعت کے معاملہ میں خلافِ شریعت تھا اور چونکہ اس بات کو بھی ماننا آسان نہیں لہٰذا بہتر یہ ہے کہ قیس بن مسلم کے اس اثر کا انکار کر دیا جائے جس طرح مالکی محدث علامہ قابسیؒ نے اس کا انکار کیا ہے۔

قیس بن مسلم کے اثر کے بعد بخاری کے ترجمۃ الباب کی عبارت یہ ہے:

وزارع علیؓ وسعدؓ بن مالك وعبدؓ الله بن مسعودؓ وعمرؒ بن عبدالعزیز والقاسمؒ وعُروۃؒ وآل ابی بکرؓ وآل عمرؓ وآل علیؓ وابن سیرینؒ۔

ترجمہ: اور مزارعت کا معاملہ کیا حضرت علی، حضرت سعد بن مالک اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم نے اور حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز، حضرت قاسمؒ، حضرت عروہؒ اور اولادِ ابوبکرؓ اولادِ عمرؓ اور اولادِ علیؓ نے اور ابن سیرینؒ نے۔

اس عبارت میں حضرت امام بخاریؒ نے تین صحابۂ کرامؓ، چار تابعینؒ اور کچھ تبع تابعینؒ کے متعلق تحریر فرمایا ہے کہ وہ مزارعت کا معاملہ کرتے اور مزارعت پر زمین دیتے تھے لیکن

صرف ان کے ناموں پر اکتفا کیا ہے وہ روایات نہ یہاں اور نہ اپنی کتاب میں کسی دوسری جگہ بیان فرمائی ہیں جن سے ان کو اس کا علم ہوا ہے کہ یہ حضرات مزارعت کا معاملہ کرتے تھے۔ کیوں بیان نہیں فرمائیں؟ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ سند و اسناد کے لحاظ سے اس معیار کے مطابق نہ تھیں جو انہوں نے مقرر فرمایا ہے یا ممکن ہے اس کی وجہ کوئی اور ہو، بہرحال اللہ جزائے خیر دے شارحین بخاری کو کہ انہوں نے وہ آثارِ صحابہ و تابعین دوسری کتابوں سے بیان کر دیئے ہیں جن کے پیشِ نظر امام بخاری نے یہ تحریر فرمایا ہے، علامہ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اور علامہ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں ان آثار کی جو تخریج کی ہے، حسب ذیل ہے:

"اما اثر علیؓ فوصلہ ابن ابی شیبۃ من طریق عمرو بن صلیع عنہ انہ لم یر بأسا بالمزارعۃ علی النصف"

"چنانچہ حضرت علیؓ کے اثر کو پوری سند کے ساتھ ابن ابی شیبہ نے عمرو بن صلیع کی روائت سے بیان کیا ہے کہ حضرت علی نصف پیداوار پر مزارعت میں کچھ حرج نہ دیکھتے تھے۔"

اس اثر کی استنادی حیثیت پر بحث کرنے سے پہلے یہ بتلا دینا ضروری ہے کہ حافظ ابن حجر العسقلانی نے اس اثر کی وہ پوری سند بیان نہیں کی جو مصنف ابن ابی شیبہ میں اس طرح ہے:

حدثنا ابوبکر قال حدثنا وکیع عن سفیان عن الحارث بن حصیرۃ عن صخر بن الولید عن عمرو بن صلیع عن علی انہ لم یر بأسا بالمزارعۃ علی النصف (ص ۲۳۹ - ج ۶)	ابوبکر بن ابی شیبہ نے کہا ہم سے بیان کیا وکیع نے، وکیع نے روائت کیا سفیان سے، سفیان نے حارث بن حصیرہ سے، اس نے صخر بن ولید سے، اس نے عمرو بن صلیع سے اس نے حضرت علی سے یہ کہ وہ نصف پیداوار پر مزارعت میں کچھ مضائقہ نہ دیکھتے تھے

اور یہی اثر مصنف عبدالرزاق میں زیادہ وضاحت کے ساتھ بایں طور ہے۔

اخبرنا عبدالرزاق عن الثوری عن الحارث بن حصیرۃ قال حدثنی صخر بن الولید عن عمرو بن صلیع المحاربی قال جاء رجل الی علیؓ	عبدالرزاق نے سفیان ثوریؒ سے روائت کیا اس نے حارث بن حصیرہ سے یہ کہ اس نے کہا مجھ سے بیان کیا صخر بن ولید نے عمرو بن صلیع سے روائت کرتے ہوئے یہ کہ

نوشی برجل، فقال انہ اخذ ارضا	اس نے کہا کہ ایک شخص حضرت علیؓ کے پاس
یصنع بھا کذا وکذا، فقال	آیا اور دوسرے شخص کی چغلی کھائی۔ یعنی یہ کہا
الرجل اخذتھا بالنصف اکری	کہ اس نے زمین لے رکھی ہے جس میں یہ یہ
انھارھا واصلحھا واعمرھا	کرتا ہے، حضرت علیؓ کے پوچھنے پر اس شخص
فقال علیؓ لا بأس	نے بتلایا کہ میں نے وہ زمین نصف پر لی
(ص ۹۹ - ج ۸)	ہے۔ اس کی نہروں کو کھودتا ہوں۔ اس کو

درست اور آباد کرتا ہوں، یہ سن کر حضرت علیؓ نے فرمایا" کچھ حرج نہیں"

اس اثر کی سند میں حارث بن حصیرہ نامی جو راوی ہے اس کی شخصیت خاصی متنازع فیہ اور مشتبہ ہے۔ علمائے جرح وتعدیل میں سے بہت سوں نے اس کی تضعیف کی اور اسے ناقابل اعتماد بتلایا ہے اور بعض نے اس کی توثیق بھی کی ہے۔ اسماء الرجال کی کتابوں مثلاً تہذیب التہذیب اور میزان الاعتدال وغیرہ میں مختلف علماء کے مختلف اقوال نقل کئے گئے ہیں۔ مثلاً ابو احمد الزبیری کا قول ہے کہ " کان یؤمن بالرجعۃ" وہ حضرت علیؓ کے دوبارہ لوٹ کے آنے کا اعتقاد رکھتا تھا، دارقطنی کے الفاظ اس کے بارے میں یہ ہیں کہ" شیخ للشیعۃ یغلو فی التشیع" یعنی حد سے بڑھا ہوا غالی قسم کا شیعہ تھا، ابن عدی نے اس کے متعلق کہا وہ ان میں سے تھا جنہوں نے کوفہ میں شیعیت کے جھوٹے عقیدے گھڑے اور پھیلائے، الازدی نے کہا " حارث بن حصیرۃ زائغ " حارث بن حصیرہ کے اندر زیغ اور کجی ہے، یحییٰ بن معین نے فرمایا: خشبی ہے یعنی اس لکڑی سے عقیدت رکھنے والا ہے جس پر زید بن علی کو سولی دی گئی تھی، نسائی نے کہا کہ ثقہ ہے، ابو حاتم نے اس کے بارے میں فرمایا اگر ثوری نے اس سے روائت نہ کی ہوتی تو اس قابل تھا کہ اس کی کوئی حدیث نہ لی جاتی وغیرہ وغیرہ بہرکیف چونکہ یہ بھی ایک قاعدہ ہے کہ جب کسی راوی کے متعلق جرح اور تعدیل کا پلڑا برابر ہو تو جرح کو تعدیل پر ترجیح دے کر راوی کو ساقط الاعتبار سمجھا جاتا ہے لہٰذا حارث بن حصیرہ کی وجہ سے اثر زیر بحث کی استنادی حیثیت سند کے لحاظ سے ضعیف و کمزور قرار پاتی ہے۔

علاوہ ازیں مصنف عبدالرزاق کی روائت میں اس اثر کی جو تفصیل ہے اس سے یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خود مزارعت کا معاملہ کیا جیسا کہ" ترجمۃ الباب" کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے بلکہ روائت کے الفاظ تو صرف یہ بتلاتے ہیں کہ ان کے

سامنے ایک خاص شخص کا مسئلہ آیا جس نے مزارعت پر زمین دے نہیں بلکہ لے رکھی تھی تو آپ نے فرمایا کچھ حرج نہیں جس کا مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس شخص کے مخصوص حالات کے پیش نظر آپ نے ایسا فرمایا ہو اور پھر یہ بھی کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ معاملہ مالک زمین کے لئے جتنا بُرا ہے کاشت کار اور مزارع کے لئے اتنا بُرا نہیں کیونکہ اس میں حق تلفی کا مرتکب مالک زمین ہوتا ہے کاشت کار نہیں ہوتا وہ تو مظلوم ہوتا ہے اور بعض حالات میں مجبور بھی۔ خلاصہ یہ کہ ایک تو یہ اثر سند کے اعتبار سے ضعیف ہے اور دوسرے اس سے ہرگز یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حضرت علیؓ مزارعت پر زمین دیتے تھے یا یہ کہ ان کے نزدیک مزارعت پر زمین دوسرے کو دینا جائز ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔

اب دوسرے صحابی حضرت سعدؓ بن مالک اور تیسرے صحابی حضرت عبداللہؓ بن مسعود کے اثر کو ملاحظہ فرمائیے جس کی تخریج حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے مصنف ابن ابی شیبۃ اور سنن سعید بن منصور سے فرمائی لیکن پوری سند کے ساتھ اس کو نقل نہیں فرمایا بلکہ صرف اوپر کے راوی موسیٰ بن طلحہؒ کے حوالہ سے نقل فرمایا ہے۔ لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ مصنف ابن ابی شیبہ سے اس اثر کو پوری سند کے ساتھ نقل کروں تاکہ اس پر کی جانے والی بحث سمجھ میں آسکے۔

حدثنا ابوبکر قال حدثنا	ابوبکر ابن ابی شیبہ نے کہا کہ ہم سے شریک
شریک بن عبداللہ عن	بن عبداللہ نے بیان کیا کہ ان سے ابراہیم
ابراھیم بن مھاجر قال	بن مہاجر نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ
سالت موسیٰ بن طلحۃ	میں نے موسیٰ بن طلحہ سے پوچھا تو اس نے
فحدثنی ان عثمان اقطع خبابا	بیان کیا کہ حضرت عثمانؓ نے جاگیر کے طور پر
ارضًا وعبداللہ ارضا، وسعدا	ایک زمین حضرت خبابؓ کو، ایک حضرت عبداللہ
ارضًا، وصُھَیبا ارضا فکلا جاریّ	بن مسعود کو، ایک حضرت سعدؓ بن ابی وقاص
قد رأیتہ یعطی ارضہ بالثلث	کو اور ایک حضرت صہیبؓ کو دی، میں نے اپنے
والربع: عبداللہ وسعدا	ہر دو پڑوسیوں کو دیکھا کہ وہ اپنی زمین تہائی
(ص ۳۳۷ ج ۶)	اور چوتھائی پر دیتے تھے یعنی عبداللہ اور سعد

سنن سعید بن منصور سے علامہ ابن حجر نے ایک روایت کا جو متن نقل کیا ہے وہ بایں الفاظ ہے:

ان عثمانؓ بن عفان اقطع خمسة من الصحابة : الزبیرؓ وسعداًؓ وابنؓ مسعود وخباباًؓ واسامة بن زید، فرأیت جاری ابنؓ مسعود وسعداًؓ یعطیان ارضیهما بالثلث (ص ٨ - ج ٥ فتح)

موسیٰ بن طلحہ نے کہا کہ حضرت عثمانؓ نے پانچ صحابہ کو بطور جاگیر زمین دی، زبیرؓ، سعدؓ، ابنؓ مسعود، خبابؓ اور اسامہؓ بن زید کو، میں نے اپنے دو پڑوسیوں عبداللہ بن مسعودؓ اور سعد بن ابی وقاص کو دیکھا کہ وہ اپنی زمینیں تہائی پر دیتے تھے۔

یہی اثر مصنف عبدالرزاق میں اس طرح ہے:

اخبرنا عبدالرزاق عن الثوری عن ابراهیم بن المهاجر عن موسیٰ بن طلحة قال اقطع عثمانؓ لخمسة من اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم : لعبدؓ اللہ ولسعدؓ وللزبیرؓ ولخبابؓ ولاسامةؓ بن زید، فکان جاراي عبدؓ اللہ وسعد یعطیان ارضهما بالثلث (ص ٩٩ - ج ٨)

عبدالرزاق نے سفیان ثوری سے روایت کیا، اس نے ابراہیم بن المہاجر سے، اس نے موسیٰ بن طلحہ سے، موسیٰ بن طلحہ نے کہا کہ حضرت عثمانؓ نے رسول اللہؐ کے پانچ صحابہ کو بطور جاگیر زمینیں دیں، عبداللہ بن مسعود، سعد بن ابی وقاص، زبیرؓ، خبابؓ اور اسامہ بن زید کو، ہمارے دو پڑوسی عبداللہ بن مسعود اور سعد بن ابی وقاص اپنی زمینیں تہائی پیداوار پہ دیتے تھے۔

اسی اثر کو امام طحاوی نے شرح معانی الآثار میں اس طرح بیان فرمایا ہے:

حدثنا فهد قال ثنا محمد بن سعید قال اخبرنا شریک عن ابراهیم بن مهاجر قال سألت موسیٰ بن طلحة عن المزارعة فقال اقطع عثمان عبد اللہ ارضاً واقطع سعداًؓ ارضاً، واقطع خباباً ارضاًؓ، واقطع صهیباًؓ ارضاً فکلا جاریؓ کانا یزارعان بالثلث والربع (ص ٢٦١ - ج ٢)

ہم سے فہد نے بیان کیا یہ کہتے ہوئے کہ ہم سے محمد بن سعید نے بیان کرتے ہوئے کہا کہ ہمیں شریک نے بتلایا کہ اس سے ابراہیم بن مہاجر نے روایت کرتے ہوئے کہا کہ میں نے موسیٰ بن طلحہ سے مزارعت کے متعلق پوچھا تو اس نے کہا کہ حضرت عثمانؓ نے عبداللہؓ بن مسعود، سعدؓ بن ابی وقاص، خبابؓ اور صہیبؓ کو بطور جاگیر الگ الگ زمینیں دیں، ہمارے دو پڑوسی عبداللہ اور سعد اپنی زمینیں تہائی و چوتھائی کے بدلے مزارعت پر دیتے تھے۔

(باقی آئندہ)

توضیحِ اشکالات

مولانا محمد طاسین صاحب

یہ تحریر دراصل ان اشکالات و اعتراضات سے متعلق ہے جو محترم جناب محمد اکرم خان صاحب ڈائریکٹر کمرشل آڈٹ لاہور نے میرے مضمون "مروجہ زمینداری اور اسلام" کے ایک حصہ پر تحریر فرمائے ہیں اور جو مکتبہ قرآن کے ستمبر ۱۹۸۳ء کے شمارہ میں بعنوان "نقد و نظر" کے تحت شائع ہوئے، اس تحریر میں بطور وضاحت اور جواب جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا سمجھنا اس صورت میں آسان ہو جائے گا جب قارئین اس تحریر کو بھی سامنے رکھیں گے جس سے میری اس تحریر کا تعلق ہے۔

موصوف محترم کے پہلے اشکال و اعتراض کا تعلق ربٰو کی اس تعریف سے ہے جو میں نے ان الفاظ سے کی تھی:

"معاملۂ ربٰو کی حقیقت و ماہیت اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس میں ایک فریق اپنا مال دوسرے کو استعمال کے لئے بطور قرض دیتا اور یہ شرط لگاتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد مقروض کو اس کا اصل مال مع اضافے کے واپس کرنا پڑے گا لہٰذا اس میں مُقرِض یعنی قرض دینے والے کے لئے اس کا اصل مال بھی بغیر کسی نقصان کے پوری طرح محفوظ رہتا ہے اس لئے کہ مقررہ وقت پر اس کے ادا کرنے کی قانونی ضمانت موجود ہوتی ہے، اور وہ اپنے اصل مال پر جو زائد لیتا ہے اس کے بدلے اس کی طرف سے مقروض کے لئے کوئی ایسی شے موجود نہیں ہوتی جو اس زائد مال کا عوض بن سکتی ہو، یعنی نہ کوئی مادی شے موجود ہوتی ہے جو اس زائد مال سے مماثلت رکھتی ہو اور نہ کوئی پیداآور محنت موجود ہوتی ہے جس کی اُجرت اس زائد مال کے برابر ہو، لہٰذا ہر وہ معاشی معاملہ، معاملۂ ربٰو کے مماثل و مشابہ ٹھہرتا ہے جس میں ایک فریق کا مال دوسرے کے استعمال میں اس قانونی تحفظ کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ مال جب واپس ہوگا تو بغیر کسی کمی و نقصان کے پورے کا پورا واپس ہوگا اور اس کے ساتھ وہ بغیر کسی پیداآور محنت کے دوسرے سے کچھ زائد مال اس وجہ سے لیتا ہے کہ دوسرے نے اس کا مال استعمال کیا اور اس سے فائدہ اٹھایا ہے۔"

محترم محمد اکرم خان صاحب نے اس عبارت کا بڑا حصہ نقل کرنے کے بعد بطور اعتراض اس پر جو تحریر فرمایا ہے وہ یہ کہ "اس دَور میں ربٰو کی یہ تعریف کسی حد تک ناقابلِ قبول ہو گئی ہے، پچھلے چالیس برسوں میں تمام دنیا میں افراطِ زر کا مسلسل رجحان پایا جاتا ہے جس کی وجہ سے مال کی قدر و قیمت، وقت گزرنے سے کم ہوتی جا رہی ہے۔ چنانچہ مقرض کو کبھی بھی اپنا اصل مال واپس نہیں ملتا بلکہ مدتِ قرض ختم ہونے پر اس کی اصل قدر و قیمت میں کمی آ چکی ہوتی ہے۔ چنانچہ پچھلے دس برسوں میں تو دنیا میں معاملہ یوں رہا ہے کہ شرحِ سود، شرحِ افراطِ زر سے کم رہی۔ چنانچہ عملاً مقرض اپنے سرمائے کا معاوضہ وصول کرنے کی بجائے اپنے سرمائے پر مقروض کو معاوضہ دیتے رہے، معاملہ کی یہ سیدھی سادھی تشریح کو ظاہری گنتی میں تو مقرض کو اپنا مال پورے کا پورا ملتا ہے معاملہ کی حقیقت کو نہیں بدل دیتا ہے، ہو سکتا ہے کہ ہم اپنی تسلّی کے لئے کسی منطقی موشگافی کا سہارا لے بھی لیں لیکن دنیا اس منطق سے کبھی مطمئن نہیں ہو سکتی۔" (ص ۴۶)

میری طرف سے اس کا وضاحتی جواب یہ ہے کہ میں نے ربٰو کی حقیقت کے بیان میں مال کا جو لفظ استعمال کیا ہے اس

سے مراد کاغذی کرنسی یعنی نوٹ نہیں بلکہ ہر وہ مال ہے جس کی ذات کے اندر مالیت اور انسان کی کسی ضرورت کو پورا کرسکنے کی صلاحیت ہو جیسے سونا چاندی کے سکے، غلّہ، کپڑے اور جانور وغیرہ وہ تمام اشیاء جو اپنے اندر مالیت اور افادیت رکھتی، بطور قرض دوسرے کو دی جاسکتی اور ان کی مثل ہوسکتی ہو، زرِ کاغذی یعنی نوٹ حقیقی طور پر اور بذاتِ خود مال نہیں بلکہ تبادلۂ اموال کا ذریعہ تسلیم کر لینے کی وجہ سے مجازی طور پر مال ہیں۔ دنیا میں افراطِ زر کا اصل سبب اسی کاغذی کرنسی کا رواج ہے اس کے ختم ہوئے بغیر انسانیت کو افراطِ زر کی مصیبت سے چھٹکارا ملنا مشکل ہے، تاریخ گواہ ہے کہ جب تک بارٹر سسٹم کے تحت اجناس ضرورت کا تبادلہ اجناس سے ہوتا تھا یا جب تک رائج الوقت سکّے سونے چاندی کے ہوتے تھے کبھی افراطِ زر کا مسئلہ اس طرح پیدا نہیں ہوا، یہ مسئلہ اس وقت سے پیدا ہوا جب سے یہ پابندی ختم ہوئی کہ کوئی حکومت صرف اتنے ہی نوٹ جاری کرسکتی ہے جتنا کہ اس کے پاس محفوظ سونا ہو، دوسری جنگ عظیم کے بعد یہ پابندی ختم ہوئی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ایک طرف حکومتوں نے اپنی مالی حیثیت سے کہیں زیادہ نوٹ چھاپنے شروع کر دیئے، دوسری طرف بعض ایسی مشینوں کی ایجاد نے کچھ لوگوں کے لئے جعلی کرنسی چھاپنے کا موقع فراہم کر دیا جو اصل کی ہو بہو کاپی کرتی ہیں حتیٰ کہ اصل و نقل میں کچھ امتیاز نہیں ہو سکتا، پھر اس میں کچھ اضافہ ان شراکتی کمپنیوں اور بنکوں کے ذریعے بھی ہوا جو اپنی مالی حیثیت سے زیادہ کاغذی شیئرز اور سندات جاری کرتے ہیں، لہٰذا ایسی صورت میں افراطِ زر کا ظہور میں آنا ایک لازمی امر ہے۔

کرنسی نوٹ جیسا کہ پہلے عرض کیا گیا فی نفسہٖ اور حقیقی معنوں میں مال نہیں بلکہ تبادلہ اموال کا ذریعہ مان لئے جانے کی وجہ سے مجازاً مال کہلاتے ہیں۔ لہٰذا اسلام کی رو سے ان کے قرضہ میں اس امر کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ بوقت قرضہ ان نوٹوں سے کوئی حقیقی مال کتنی مقدار میں مل سکتا تھا جتنی مقدار میں وہ مال مل سکتا تھا نوٹوں کی تعداد کی بجائے اس کو قرضہ متصور کیا جائے اور پھر ادائیگی اس کے مطابق ہو، مثلاً زید نے بکر کو سو روپے کے کرنسی نوٹ ایک سال کے لئے بطور قرض دیئے جبکہ دیتے وقت ان کے عوض بازار میں ایک من غلّہ مل سکتا تھا تو اس صورت میں نوٹوں کی بجائے ایک من غلّہ کو قرض تصوّر کیا جائے گویا بکر نے زید سے ایک من غلّہ ایک سال کیلئے قرض لیا۔ لہٰذا ایک سال کے بعد بکر پر لازم ہوگا کہ وہ زید کو اتنی رقم ادا کرے جتنی اسوقت ایک من گندم یا چاول کے برابر ہو، اگر ایک سال کے بعد بھی فرض کیجئے ایک من غلّے کی قیمت سو ہی روپے رہی تو ادائیگی سو روپے سے ہوگی۔ اور اگر ایک سو دس روپے ہوگئی تو ایک سو دس روپے ادا کرنا لازم ہوں گے، اور اگر وہ قرضہ سود پر لیا دیا گیا ہو تو پہلی صورت میں سو روپے پر جو زائد اور دوسری صورت میں ایک سو دس روپے پر جو زائد لیا دیا جائے گا وہ ربائے حرام کے حکم میں ہوگا۔

بہرحال جب ربوٰ کی مذکورہ تعریف میں مال سے مراد محض کرنسی نوٹ نہ ہوں بلکہ وہ تمام اشیاء ہوں جو حقیقی طور پر مال کی تعریف میں آتی ہیں اور جن کا بطور مثال اوپر ذکر کیا گیا تو ظاہر ہے کہ مرورِ وقت اور افراطِ زر سے ان کی قدر و قیمت میں نہ صرف یہ کہ کوئی کمی واقع نہیں ہوتی بلکہ موجودہ حالات میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ لہٰذا وہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے جو جناب محمد اکرم خان صاحب کی طرف سے سود کی مذکورہ تعریف پر کیا گیا اور کہا گیا کہ اس دور میں ربوٰ کی یہ تعریف کسی حد تک ناقابل قبول ہوگئی۔

اس ضمن میں موصوف نے میری اس بات سے بھی اختلاف کیا جو میں نے معاملۂ مزارعت اور معاملۂ ربوٰ کے مابین مماثلت اور مشابہت کی توجیہہ کرتے ہوئے ان الفاظ سے لکھی تھی "کہ جس طرح معاملۂ ربوٰ میں سود خور کے لئے اس کی اصل رقم اس کے حق میں محفوظ رہتی اور معاملہ ختم ہونے پر اس کو بے کم و کاست پوری ملتی ہے۔ اسی طرح معاملۂ

مزارعت میں بھی مالک کے لئے زمین محفوظ رہتی اور معاملہ ختم ہونے پر پوری کی پوری اسے واپس ملتی ہے۔ کاشت کے بعد اس کی قیمت و مالیت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوتی یعنی ایسا نہیں ہوتا کہ ایک زمین جس کی قیمت کاشت سے پہلے مثلاً ایک ہزار روپے فی ایکڑ تھی کاشت ہو جانے کے بعد اس کی قیمت نو سو روپے فی ایکڑ رہ جاتی ہو بلکہ اس کے برعکس بعض دفعہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ ایک بنجر زمین کو کاشت کار خوب محنت کر کے اور کھاد پانی وغیرہ صحیح طور پر دیتا ہے تو ایسی کاشت سے اس زمین کی قدر و قیمت کچھ بڑھ جاتی ہے۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ زمین ان چیزوں میں سے نہیں جو استعمال ہونے سے گھستی اور پرانی ہوتی — لہٰذا لازماً ان کی قیمت گھٹتی اور مسلسل کم ہوتی چلی جاتی ہے۔

محترم محمد اکرم خان صاحب نے میری اس پوری عبارت میں سے صرف یہ ٹکڑا "اسی طرح معاملۂ مزارعت میں مالک کے لئے زمین محفوظ رہتی اور معاملہ ختم ہونے پر پوری کی پوری واپس ملتی ہے۔" الگ کر کے اس پر ان الفاظ سے تنقید فرمائی ہے: "یہ بھی معاملہ کی ظاہری حالت ہے ورنہ کس کو یہ حقیقت نہیں معلوم کہ فصل اُگنے کے بعد زمین کی پیداواری صلاحیت کم ہو جاتی ہے چنانچہ وہ زمین جس پہ پے در پے فصلیں اگائی جائیں اور وہ زمین جس پہ کبھی کاشت نہ ہوئی ہو اپنی زرخیزی میں مختلف ہوتی ہے .... الخ"

مطلب یہ کہ معاملۂ مزارعت ختم ہونے پر مالک زمین کو اس کی زمین، پوری کی پوری نہیں بلکہ کمی کے ساتھ واپس ہوتی ہے اس کا جواب میری طرف سے یہ کہ زمین میں جو پیداواری صلاحیت ہوتی ہے وہ قدرتی اسباب و عوامل کے زیر اثر وجود میں آتی اور ایک خالص قدرتی چیز ہوتی ہے اور وہ اس شخص کے لئے قدرت کا مفت عطیہ ہوتی ہے جو زمین کو کاشت کرتا اور خلق خدا کے فائدہ کے لئے فصل اگاتا ہے، چونکہ یہ چیز کسی انسان کی سعی و محنت کا نتیجہ نہیں ہوتی لہٰذا نہ کوئی شخص اس کا مالک ہوتا ہے اور نہ اس کا کوئی کسی سے معاوضہ وصول کر سکتا ہے، زمین کاشت ہونے سے جس طرح اس میں کمی آتی ہے۔ اسی طرح کاشت کے بعد یونہی چھوڑ دینے سے خود بخود اس میں پیداواری صلاحیت قدرتی عوامل کے زیر اثر دوبارہ لوٹ آتی اور کمی پوری ہو جاتی ہے، جہاں تک کھاد کا تعلق ہے وہ اس لئے ڈالی جاتی کہ پیداوار میں اضافہ ہو اور پھر جو زمین کو کاشت کرتا ہے وہی اپنے خرچ سے کھاد ڈالتا ہے اب اگر کاشت کے بعد زمین میں وہ کھاد والی زرخیزی نہیں رہتی تو اس سے مالک زمین کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا اور معاملۂ مزارعت ختم ہونے پر اسے اس کی زمین پوری مل جاتی ہے، بہرحال زمین ان چیزوں میں سے نہیں جو استعمال ہونے سے ذاتی طور پر گھستی، گھٹتی اور بوسیدہ ہوتی لہٰذا دن بدن ان کی قیمت اور مالیت کم ہوتی جاتی ہے جیسے کوئی مشین وغیرہ یہی وجہ ہے کہ مکان کی طرح زمین کے لئے کرائے کے کوئی اصول و قواعد مقرر نہیں جن سے اس کے کرائے کی تشخیص کی جاتی ہو۔

(۲) جناب محمد اکرم خان صاحب کے دوسرے اشکال کا تعلق میری اس توجیہہ و تعلیل سے ہے جو میں نے معاملۂ بیع کے حلال و جائز ہونے کے بارے میں لکھی، موصوف نے یہاں بھی اس بارے میں میری پوری عبارت کا ٹکڑا نقل کر کے اس پہ اعتراض فرمایا ہے۔ آگے پیچھے کی پوری عبارت کا لحاظ رکھتے تو شاید اعتراض کی نوبت ہی نہ آتی۔ آگے کی عبارت سے مراد، اس ٹکڑے سے متصل بعد والی عبارت ہے اور پیچھے کی عبارت سے مراد پچھلے صفحہ پر چھپی ہوئی وہ عبارت ہے جو بیع کی حقیقت کی وضاحت میں لکھی گئی ہے، بہرحال موصوف نے میری عبارت کے جس ٹکڑے پر اظہار خیال فرمایا ہے وہ یہ ہے: "معاملۂ بیع کو اس لئے حلال و جائز ٹھہرایا ہے کہ یہ عدل کے مطابق ہے۔ کیونکہ اس میں فریقین آپس میں

جو لیتے دیتے ہیں ایک دوسرے کا حق سمجھ کر دیتے لیتے ہیں۔ لہٰذا اس میں ان کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے"۔
اور جس تحریر سے اظہار خیال فرمایا ہے وہ یہ ہے: "بیع کی حلت کے لئے جو وجوہ بیان ہوئے ہیں وہ بہت حد تک ربٰو پر بھی عائد ہوتے ہیں، ساری دنیائے مغرب میں کاروباری مقاصد کے لئے سرمائے پر سود دینے والے، سود کو سرمایہ دار کا حق سمجھ کر بطیبِ خاطر دیتے ہیں حقیقی رضامندی کا تو یہ عالم ہے کہ بنکوں اور مالیاتی اداروں سے قرض لینے والوں کا تانتا بندھا ہوتا ہے ـــــ اگر باہم رضامندی ہی کسی معاملہ کو بیع بناتی ہو تو استحصال کے تمام معاملات ربٰو سے بیع بن جائیں۔ اگر فریقین خوشدلی سے وہ طے کرلیں، اس طرح کا موضوعی پیمانہ بہت سے معاملات کو مشتبہ کرسکتا ہے اور کسی قانون کی بنیاد نہیں بن سکتا۔"

اس کے جواب میں پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ میری عبارت کے مذکورہ ٹکڑے میں جس پر اعتراض کیا گیا ہے بلاشبہ کچھ ابہام اور اجمال ہے جس سے غلط فہمی پیدا ہوسکتی تھی لہٰذا میں نے اس کی مزید وضاحت کیلئے اس کے بعد متصل یہ لکھا "کچھ واضح الفاظ میں مطلب یہ کہ معاملۂ بیع میں تاجر اپنے اصل سرمائے پر خریدار سے جو زائد مال لیتا ہے یعنی مثلاً سو روپے میں خریدی ہوئی چیز ایک سو دس روپے میں بیچ کر جو دس روپے زائد لیتا ہے اس زائد کے عوض چونکہ اس کی طرف سے محنت موجود ہوتی ہے جو سب کے نزدیک پیدائشِ دولت کا متفقہ و مسلمہ عامل ہے لہٰذا وہ اس زائد مال کا حقدار ٹھہرتا اور خریدار اسے حقدار سمجھ کر زائد مال اس کو برضا و خوشی دے دیتا ہے گویا اس محنت کی اُجرت کے طور پر اسے دیتا ہے جو اس نے خرید و فروخت کے سلسلہ میں کی ہوتی ہے"۔ اس عبارت سے نیز ان عبارتوں سے جو معاملۂ بیع اور معاملۂ ربٰو کی عرفی حقیقت اور معاملۂ ربٰو کے حرام ہونے کی وجہ کے بیان میں ص ۳۶، ۳۷ پر تحریر ہیں، بخوبی واضح ہوتا ہے کہ اس مختصر و مجمل عبارت میں حقیقی رضامندی سے میری مراد کیا ہے، یعنی یہ واضح ہوتا ہے کہ اس سے میری مراد وہ رضامندی ہے جس کے وجود کا تعلق ہر فریق کو اس کا حق ملنے سے ہے اور حق بھی وہ جسے اسلام تجویز اور تسلیم کرتا ہے کیونکہ یہ ساری گفتگو اسلام کے حوالے سے ہو رہی ہے، سرمایہ داری اور اشتراکیت کے حوالے سے نہیں ہو رہی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ باوجود رضامندی پائے جانے کے معاملۂ ربٰو کو حرام و ناجائز کہا گیا ہے اس لئے کہ اس میں ایک فریق دوسرے سے قرض کی اصل رقم کی واپسی کے ساتھ جو مزید بطور سود لیتا ہے اسلام اسے اس کا حق تسلیم نہیں کرتا اور دوسرے فریق کی حق تلفی قرار دیتا ہے اگرچہ دونوں فریق اسے حق تسلیم کرتے اور برضاء و رغبت لیتے دیتے ہیں، دراصل اسلام میں معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم کا اپنا ایک خاص تصوّر ہے جو اُن تصوّرات سے مختلف ہے جو دوسرے معاشی نظاموں میں معاشی حق اور معاشی عدل و ظلم سے متعلق پائے جاتے ہیں، اسی وجہ سے اسلام میں معاشی معاملات کے جواز اور عدم جواز اور درست و نادرست کا جو اصولی ضابطہ ہے وہ ان اصولی ضوابط سے مختلف ہے جو دوسرے معاشی نظاموں یعنی سرمایہ داری اور اشتراکیت میں پائے جاتے ہیں۔

غرضیکہ اسلام کے نزدیک معاشی معاملات کی صحت و عدم صحت میں جس رضامندی کے ہونے نہ ہونے کا اعتبار ہے وہ نہ تو محض ایسے الفاظ ہیں جو رضامندی پر دلالت کرتے ہوں، نہ چہرے کی کوئی ایسی کیفیت ہے جو عموماً رضا و خوشی کے وقت ظاہر ہوا کرتی ہے اور نہ کوئی ایسی تحریر ہے جو اظہارِ رضامندی کے لئے لکھی جاتی ہے بلکہ اس رضامندی کا حقیقی اور معروضی معیار اسلام کے تصوّرِ حق و عدل کے مطابق ہر فریق کو اس کے حق کا ملنا ہے۔ کیونکہ انسان کو قلبی مسرّت و طمانیت اس وقت حاصل ہوتی ہے جب اسے اس کا صحیح حق ملتا ہے اور حق تلفی کی صورت

ہیں اس کے دل کو فرد رنج والم پہنچتا ہے خواہ وہ ظاہری طور پر کیسی ہی رضا و خوشی کا اظہار کیوں نہ کرے، پھر جس طرح کسی بُرے کام کو اچھا کام سمجھ کر کرنے سے وہ اچھا کام نہیں ہو جاتا اور اس کے بُرے اثرات سے انسان نہیں بچ سکتا، اسی طرح جس معاملے کو اس کی برائی کی وجہ سے شریعت نے حرام قرار دیا ہو خوشی و رضامندی کے ساتھ اختیار کرنے سے وہ کبھی حلال نہیں ہو سکتا۔

بالفاظِ دیگر اسلام میں معاملات کے صحیح و فاسد اور حق و باطل ہونے کا اصل دار و مدار عدل پر ہے جس کے معنے ہیں ہر فریق کو اس کا حق ٹھیک ٹھیک ملنا، لہٰذا جو معاشی معاملہ عدل کے مطابق ہو وہ صحیح و حق اور جو مطابق نہ ہو وہ فاسد اور باطل ہے۔ اور چونکہ جو معاملہ عدل کے مطابق ہو فریقین اسے رضا و خوشی کے ساتھ اختیار کرتے ہیں، لہٰذا قرآن مجید کی جس آئت میں تجارت کے معاملہ کو باطل معاملات سے مستثنیٰ کیا گیا ہے اس میں تجارت کے ساتھ رضامندی کا ذکر ہے۔ اس آئت سے میری مراد سورۃ النساء کی یہ آیت ہے:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِنْكُمْ

اے مومنو! آپس میں ایک دوسرے کا مال باطل و ناحق طریقوں سے نہ کھاؤ۔ سوائے اس کے کہ وہ طریقہ باہمی رضامندی سے تجارت کا طریقہ ہو۔

مفسرین کے نزدیک تجارت سے مراد لین دین کا ہر وہ طریقہ ہے جس میں ہر فریق کو اس کی چیز کا ایسا عوض اور بدل ملتا ہو جسے اسلام نے عوض و بدل تسلیم کیا ہے۔ مثلاً معاملۂ سود میں سود کو جائز کہنے والے اس کے جواز کے لئے جن چیزوں کا ذکر کرتے ہیں جیسے وقت، تاخیر اور خطرہ وغیرہ۔ اسلام ان کو اس زائد مال کا عوض تسلیم نہیں کرتا جو قرض خواہ بطور سود قرض دار سے لیتا ہے۔ بعض مفسرین نے اس آئت میں تجارت کے مصداق دو طریقے لکھے ہیں: ایک خرید و فروخت اور بیع و شراء کا طریقہ اور دوسرا اُجرت و تنخواہ پر مزدوری و ملازمت کا طریقہ، کیوں کہ ان دونوں میں ہر فریق کو اس کی چیز کا جو عوض ملتا ہے اسلام کی رُو سے صحیح عوض ہے بشرطیکہ کسی کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھایا گیا ہو جیسا کہ بعض دفعہ دکاندار اپنے گاہک اور مستاجر اپنے اجیر کی مجبوری سے اٹھا لیتا ہے۔

میری اس وضاحت کے بعد جناب محمد اکرم خان صاحب کا وہ اعتراض خود بخود رفع ہو جاتا ہے جو انہوں نے میری مختصر و مجمل عبارت پر وارد فرمایا اور جو اوپر نقل کیا گیا ہے، البتہ میں یہاں یہ ضرور عرض کروں گا کہ اس میں مغربی دنیا کی کوئی تخصیص نہیں مشرقی دنیا بلکہ پاکستان میں بھی لوگ کاروباری مقاصد کے لئے بنکوں اور مالیاتی اداروں سے ایک دوسرے سے بڑھ چڑھ کر سودی قرضے لیتے اور اپنے کاروبار چلاتے ہیں لیکن اس حقیقت کا کون انکار کر سکتا ہے کہ وہی لوگ کاروباری مقاصد کے لئے سود پر سرمایہ حاصل کرتے ہیں جن کے پاس حسبِ ضرورت اپنا سرمایہ نہیں ہوتا گویا وہ ایک حقیقی یا مصنوعی مجبوری کے تحت ایسا کرتے ہیں اور اس کا ثبوت یہ کہ جس کے پاس حسب ضرورت اپنا سرمایہ ہو وہ دوسروں سے کبھی سود پر سرمایہ حاصل نہیں کرتا۔ کیونکہ اس صورت میں اسے اپنے حاصل شدہ کاروباری منافع کا ایک خاص حصہ بطور سود دوسروں کو دے دینا پڑتا ہے جبکہ اپنے سرمائے کے ساتھ کاروبار کرنے کی صورت میں پورا منافع اس کے پاس رہتا ہے، اور کون ہے جو خوشی کے ساتھ پورے کے مقابلے میں ادھورے کو اختیار کرتا اور دل سے چاہتا ہے کہ اس کی کمائی کا ایک خاصا حصہ دوسرے کے پاس چلا جائے جبکہ اس پر کسی اجر و ثواب کی بھی امید نہ ہو جو صدقے و خیرات وغیرہ میں ہوتی ہے۔

جناب محمد اکرم خان صاحب کے تیسرے اشکال و اعتراض کا تعلق بھی میری اس توجیہہ سے ہے جو میں نے معاملۂ بیع

کے حلال وجائز ہونے کے بارے میں عرض کی ہے، اور توجیہہ کے جس پہلو سے ہے وہ یہ کہ میں نے معاملۂ بیع میں منافع کے استحقاق کا واحد سبب صرف تاجر کی محنت کو بتلایا ہے اس کے ساتھ سرمائے کو ایک دوسرے سبب کی حیثیت سے شریک نہیں کیا۔

اعتراض واشکال کا ماحصل یہ کہ اگر بالفرض یہ مان لیا جائے کہ عامل پیدائش دولت صرف محنت ہے سرمایہ کسی شکل میں نہیں تو اس سے یہ لازم آتا ہے کہ اجرتوں اور معاوضوں کا موجودہ نظام، نیز مشترک سرمائے کی کمپنیوں اور دیگر ایسے کاروبار کا نظام جن میں کچھ لوگوں کا صرف سرمایہ ہوتا اور کچھ لوگوں کی دماغی وجسمانی محنت ہوتی ہے اور منافع میں سب شریک ٹھہرتے ہیں، غلط وناجائز ہے، حالانکہ یہ اسلام کی رو سے غلط وناجائز نہیں بلکہ صحیح اور جائز ہے۔ لہٰذا اس کا لازمی مطلب یہ ہوا کہ صرف محنت کو پیدائشِ دولت کا سبب وعامل سمجھنا درست نہیں۔

اس کا جواب لکھنے سے پہلے میں جناب محمد اکرم خان صاحب کے علم میں یہ بات ضرور لاؤں گا کہ زمیندار سے متعلق میرا یہ جو مضمون ماہنامہ "حکمتِ قرآن" میں شائع ہو رہا ہے اس کے پہلے مسودے میں میں نے اسی مقام پر قدرے تفصیل کے ساتھ لکھا تھا کہ معاشی معاملات کے حلال وحرام اور جائز وناجائز سے متعلق اسلام کا یہ اصولی ضابطہ دراصل اس تصور پر مبنی ہے کہ دولت صرف محنت وعمل سے پیدا ہوتی ہے سرمائے سے پیدا نہیں ہوتی، اور پھر اس تصور کے حق اور مطابق واقعہ ہونے پر متعدد دلائل بھی عرض کئے تھے، اسی طرح اس مسئلے پر میں نے اپنے مضامین "اسلام وسرمایہ داری" اور "مضاربت کی شرعی حیثیت" میں بھی قدرے تفصیل سے بحث کی ہے۔

موصوف یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عوامل پیدائش دولت کا مسئلہ معاشیات کا ایک نہایت اہم اور بنیادی مسئلہ ہے تقسیم دولت اور تبادلۂ دولت کا اس سے بڑا گہرا اور مضبوط تعلق ہے، بلکہ یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ مختلف معاشی نظاموں کے مابین جو اختلاف ہے اس کا ایک بنیادی سبب وہ اختلاف ہے جو ان کے درمیان عوامل پیدائشِ دولت کے مسئلہ میں پایا جاتا ہے، نظام سرمایہ داری چونکہ محنت اور سرمائے دونوں کو عامل پیدائش دولت مانتا ہے۔ لہٰذا اس کے اندر کاروبار کی ایسی تمام شکلیں قانونی طور پر جائز قرار پاتی ہیں جن میں ایک کی محنت ہوتی ہے دوسرے کا سرمایہ ہوتا اور منافع میں دونوں شریک اور حصہ دار ٹھہرتے ہیں، اسی طرح تجارتی مقاصد کے قرضوں پر سود کا لین دین بھی اس نظام میں بالکل جائز سمجھا جاتا ہے اور قانون اس کا تحفظ کرتا ہے، جبکہ نظام اشتراکیت چونکہ صرف محنت کو پیدائش دولت کا عامل قرار دیتا ہے لہٰذا ایسے تمام کاروبار اس کے ہاں قانوناً ناجائز وممنوع ٹھہرتے ہیں جن میں ایک فریق بغیر کسی محنت ومشقت کے محض سرمائے کی بنیاد پر منافع کے ایک حصہ کا حقدار ٹھہرتا ہے، جہاں تک اسلامی معاشی نظام کا تعلق ہے میرے علم وفہم کے مطابق وہ عوامل پیدائشِ دولت کے مسئلہ میں نظام سرمایہ داری کے مخالف اور نظام اشتراکیت کے موافق ہے، گویا اسلام کے نزدیک بحیثیت مجموعی اگرچہ مذکورہ دونوں نظام غلط وباطل ہیں لیکن ان کے اجزاء ترکیبی میں بعض اجزاء صحیح وحق بھی ہیں کیونکہ اگر کسی باطل نظام میں سرے سے حق کا کوئی عنصر ہی نہ ہو تو وہ ایک دن بھی نہیں چل سکتا اگرچہ ایسا نظام اپنے باطل عناصر کی وجہ سے بالآخر ضرور ناکام اور ذلیل ہو کر رہتا ہے۔

اسلام چونکہ بلحاظ زمانہ نظام سرمایہ داری اور نظام اشتراکیت دونوں سے صدیوں مقدم ہے۔ لہٰذا صحیح احتمال یہی ہو سکتا ہے کہ ان دونوں نظاموں میں جو حق کا عنصر ہے وہ اسلام کی بدولت انہیں ملا ہوا اور پھر جہاں تک اس تصور ونظریے کا تعلق ہے کہ دولت صرف محنت سے پیدا ہوتی ہے سرمائے سے پیدا نہیں ہوتی۔ کارل مارکس سے کئی صدیاں پہلے مشہور مسلمان مفکر علامہ ابن خلدون نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب مقدمۂ تاریخ میں اس مسئلہ پر بحث کی اور اس نظریے کو صحیح بتلایا ہے

اسی طرح متقدمین و متاخرین میں سے کئی مفسرین کرام نے تحریم ربوٰ کی تفسیر میں جو لکھا ہے اس سے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ یہ نظریہ درست ہے، میں نے اپنے بعض مضامین میں علامہ ابن خلدون اور مفسرین کرام کی وہ عربی عبارات نقل کی ہیں جو نظریۂ مذکور کی صحت پر دلالت کرتی ہیں یہاں میں بخوف طوالت ان کو نقل نہیں کر رہا، گرچہ ضرورت پڑنے پر نقل کر سکتا ہوں۔

معاشیات کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ سرمایہ دارانہ معاشیات کی کتابوں میں عوامل پیدائش دولت چار بیان کئے جاتے ہیں: لینڈ، لیبر، کیپیٹل اور آرگنائزیشن، لینڈ کے مفہوم میں نہ صرف یہ کہ سطح زمین کی تمام قدرتی چیزیں بلکہ اس کے اندر کی بھی سب چیزیں، نیز ہوا، پانی، روشنی، حرارت، برودت وغیرہ جملہ قدرتی اشیاء داخل ہیں، لیبر کے مفہوم میں ہر قسم کی جسمانی و دماغی محنت شامل ہے جو کسب معاش کے سلسلہ میں کی جائے، کیپیٹل کا مصداق وہ تمام اموال ہیں جو لینڈ اور انسانی محنت سے وجود میں آتے اور جن کے ذریعے زراعت، صنعت اور تجارت میں مدد لی جاتی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ تمام مصنوعی اشیاء کیپیٹل اور سرمائے کے تحت آتی ہیں جو مختلف قسم کے معاشی کاروبار میں استعمال ہوتی ہیں۔ آرگنائزیشن کا مطلب وہ تنظیم اور منصوبہ بندی ہے جو ایک یا ہر فن مذکورہ عناصر سے فائدہ اٹھانے کے لئے تجویز کرتا اور روبکار لاتا گویا یہ بھی ایک خاص قسم کی دماغی محنت ہے، چونکہ لینڈ ایک قدرتی چیز ہے جس سے فائدہ اٹھانے کا سب کو یکساں حق ہے لہٰذا تقسیم دولت کے نقطہ نظر سے لینڈ کا ذکر خارج از بحث ہے تو پھر بنیادی طور پر دو ہی عامل پیداوار رہ جاتے ہیں۔ ایک محنت اور دوسرا سرمایہ، محنت وہ عامل پیداوار ہے جس پر سب کا اتفاق ہے ہر معاشی نظام اسے مانتا اور حقیقت کی طرح تسلیم کرتا ہے۔ البتہ سرمائے کے عامل پیداوار ہونے میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نظام سرمایہ داری اسے پورے شد و مد کے ساتھ عامل پیداوار مانتا اور کہتا ہے کہ کسی کاروبار میں جو آمدنی ہوتی ہے اس میں محنت اور سرمائے دونوں کا حصہ ہوتا ہے اگرچہ یہ نظام اس کا تعین نہیں کرتا اور نہیں کر سکتا کہ فیصد کے لحاظ سے کتنا کس کا حصہ ہوتا ہے یعنی اس بارے میں اس کے پاس کوئی مستقل اور سائنٹفک اصول و ضابطہ نہیں جو حقیقت پر مبنی اور معقول و قابل فہم ہو اور سرمایہ دار اور محنت کش دونوں اس کو معیار و مقیاس تسلیم کرتے اور اس کے مطابق پیدا شدہ دولت یا آمدنی کی تقسیم عمل میں لاتے ہوں محنت سے پیدا شدہ حصہ بطور حق کے محنت کش کو سرمائے سے پیدا شدہ حصہ بطور حق کے سرمایہ دار کو ملتا ہو، اس نظام میں تعین حق کا معاملہ فریقین پر چھوڑ دیا گیا ہے وہ آپس میں جس طرح طے کرلیں وہی ہر ایک کا حق ہے لیکن عملاً یہ طے کرنا سرمایہ دار کے اختیار میں ہوتا ہے اور وہ کوشش کرتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ خود لے اور کم سے کم محنت کش کو دے اور پھر تعین حق اور عدل کا پیمانہ مختلف حالات کے تحت مختلف شکلیں اختیار کرتا اور برابر بدلتا رہتا ہے آج جو حق و عدل کا مصداق ہوتا کل وہی ناحق اور ظلم کا مصداق قرار پاتا ہے، دیکھا جائے تو سرمایہ دارانہ نظاموں میں سرمایہ دار اور محنت کش کے مابین جو کشمکش اور آویزش پائی جاتی ہے اور جس کا سلسلہ کہیں ختم نہیں ہو پاتا، اس کا بڑا سبب یہی مبہم اور مجہول اصولی تصور ہے کہ محنت اور سرمایہ دونوں دولت کو پیدا کرتے ہیں۔

اشتراکی نظام اصولی طور پر سرمائے کے عامل پیداوار ہونے کا انکار کرتا اور صرف محنت کو عامل پیداوار قرار دیتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی اشتراکی معاشرہ اس اصول پر عمل کرنے میں پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکا یعنی محنت سے پیدا شدہ پوری پیداوار مزدور کو نہیں دے سکا، اس ناکامی کا انہیں اعتراف ہے۔ لیکن وہ اس کی ذمہ داری عالمی حالات پر ڈالتے ہیں جو بقول ان کے سرمایہ داروں کے پیدا کردہ ہیں، بہرحال وہ اس اصول کے صحیح اور قابل عمل ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔

چونکہ عوامل پیدائش دولت کے متعلق مذکورہ دو تصورات کے سوا تیسرا کوئی تصور ممکن نہیں لہٰذا سوال پیدا

ہوتا ہے کہ اسلام کے نزدیک ان دو تصورات میں سے کونسا صحیح اور کونسا غلط ہے، اور اسلام کی معاشی تعلیمات، ان دو تصورات میں سے کس تصور سے جوڑ کھاتی اور مطابقت رکھتی ہیں! جہاں تک میرے علم و فہم، غور و فکر اور تحلیل و تجزیے کا تعلق ہے میں اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اسلام کے نزدیک مذکورہ دو تصوروں میں سے صحیح تصور وہ ہے جس کی رو سے صرف محنت عامل پیداوار قرار پاتی اور سرمائے کے عامل پیداوار ہونے کی نفی ہوتی ہے، اور بلاشبہ یہی وہ تصور ہے جو ان معاشی تعلیمات سے مطابقت رکھتا ہے جو قرآن و حدیث میں معاشی معاملات سے متعلق مذکور ہیں۔ پھر یہی وہ تصور ہے جو اسلام کے ان معاشی مقاصد سے گہرا تعلق رکھتا ہے جن کو وہ اپنے مثالی معاشرے میں برئے کار لانا چاہتا ہے، نیز اسی اصولی تصور کی بنیاد پر معاشی حق و عدل کا ایسا معیار وجود میں آتا ہے جو مستقل طور پر ہمیشہ ایک ہی حالت پر قائم و برقرار رہتا ہے اور زمان و مکان اور احوال و ظروف کی تبدیلی کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتا اور باہمی نزاع و تصادم کا باعث نہیں بنتا، اسی طرح یہی وہ اصولی تصور ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے قومی دولت معدودے چند ہاتھوں میں نہیں سمٹتی بلکہ اس کی گردش کا دائرہ پورے معاشرے میں پھیلتا اور سب کو اس سے مستفید ہونے کا موقع ملتا ہے نیز غیر فطری قسم کا معاشی نشیب و فراز دور ہوتا اور اس کی جگہ معاشرے میں معاشی اعتدال و توازن ظہور میں آتا ہے ہر فرد کو کسی نہ کسی شکل میں معاشی خوشحالی بھی نصیب ہوتی ہے اور معاشی ترقی کا بھی موقع ملتا ہے علیٰ ہذا القیاس اس اصول پر عمل کرنے سے ملکی پیداوار اور قومی ثروت میں مسلسل اور روز افزوں اضافہ ہوتا اور خوشحالی بڑھتی ہے۔

علاوہ ازیں تصور مذکور حقیقت واقعہ کے بھی عین مطابق لہٰذا ایک سچا اور مبنی برحق تصور ہے کیونکہ حقیقت میں کوئی سرمایہ کسی شے کو پیدا نہیں کرتا پیداوار تمام تر قدرتی مواد اور انسانی محنت سے وجود میں آتی ہے بلکہ سرمایہ خود انہی دو چیزوں سے وجود میں آتا ہے، اور اصل ہوتا یہ ہے کہ ایک انسان جب قدرتی اشیاء میں سے جن کے مجموعے کو اصطلاح میں لینڈ کہا جاتا ہے کسی شے کے اندر اپنی سعی و محنت سے ایسا تصرف اور ردوبدل کرتا ہے جس سے اس شے کے اندر ایک افادیت پیدا ہوتی اور وہ ایک قابل معاوضہ قیمتی شے بن جاتی ہے تو پھر یہی قابل معاوضہ قیمتی شے ایک لحاظ سے دولت اور دوسرے اعتبار سے سرمایہ کہلاتی ہے۔ یعنی اس کا مالک اگر اسے اپنے ذاتی صرف و استعمال کے لئے مخصوص کر لیتا ہے تو معاشیات کی اصطلاح میں اسے ویلتھ یعنی دولت اور اگر اسے مزید آمدنی اور کمائی کا ذریعہ بنا لیتا ہے تو اسے اصطلاح میں کیپٹیل یعنی سرمایہ اور راس المال کہتے ہیں، گویا حقیقت و ماہیت کے لحاظ سے دولت اور سرمائے میں کچھ فرق نہیں۔ فرق جو کچھ ہے وہ اعتباری ہے جس کا تعلق مالک شے کے قصد و ارادے سے ہے، اور پھر جو قابل معاوضہ قیمتی شے ایک اعتبار سے دولت اور دوسرے اعتبار سے سرمایہ کہلاتی ہے تجزیہ کر کے دیکھا جائے تو وہ صرف دو چیزوں سے مرکب نظر آتی ہے: ایک کوئی قدرتی مادہ اور دوم انسانی محنت کے مفید اثرات جن سے مادے میں قدر و قیمت پیدا ہوئی، اور وہ ایک قابل معاوضہ قیمتی شے بنا، اس کے بعد اس قابل معاوضہ قیمتی شے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب انسان اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو وہ جزوی یا کلی طور پر تحلیل ہو کر اسے کوئی فائدہ ضرور پہنچاتی ہے لیکن اپنے وجود کو جوں کا توں قائم و برقرار رکھتے ہوئے کسی دوسری قیمتی شے کو کبھی پیدا نہیں کر سکتی، مطلب یہ کہ وہ شے جب بطور دولت، ذاتی صرف میں لائی جاتی ہے تو وہ انسان کی کسی خواہش اور ضرورت کو پورا کرتی اور اسے فائدہ پہنچاتی ہے لیکن جیسا کہ مشاہدہ ہے اس صورت میں وہ دفعتہً یا رفتہ رفتہ تحلیل ہو کر ختم ہو جاتی ہے، اسی طرح جب وہ شے بطور سرمایہ کسی کاروبار مثلاً زراعت، صنعت اور تجارت میں استعمال ہوتی ہے تو اس وقت بھی اس سے انسان کو پیداوار اور منافع کی شکل میں ضرور فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن اس صورت میں بھی اس سے جو فائدہ حاصل ہوتا ہے اس شے کے جزوی یا کلی طور پر تحلیل ہو جانے سے

حاصل ہوتا ہے۔ یہ بھی عام مشاہدہ ہے جس سے انکار ممکن نہیں، دراصل اس صورت میں یہ ہوتا ہے کہ اس شے کی قدر و قیمت جزوی یا کلی طور پر اس دوسری قیمتی شے کی قدر و قیمت میں منتقل اور شامل ہوجاتی ہے جو کسی کاروبار سے وجود میں آتی ہے۔ مثلاً زراعت سے زرعی پیداوار کی شکل میں جو قابلِ معاوضہ قیمتی شے حاصل ہوتی ہے اس کی قدر و قیمت میں وہ قدر و قیمت بھی شامل ہوتی ہے جو اس میں استعمال شدہ بیج، کھاد، بیل وغیرہ کی تھی، یا مثلاً کسی صنعت سے مصنوعات کی شکل میں جو قیمتی سامان حاصل ہوتا ہے اس کی قدر و قیمت میں وہ قدر و قیمت بھی شامل ہوتی ہے جو اس صنعت میں استعمال شدہ خام مواد اور ایندھن وغیرہ کی تھی، اسی طرح اس میں وہ قدر و قیمت بھی شامل ہوتی ہے جو اس صنعت میں استعمال شدہ آلات و اوزار اور مشینوں کے گھسنے اور تحلیل ہونے سے ان کی قدر و قیمت میں جزوی کمی کی صورت میں نمودار ہوئی، غرضیکہ کسی کاروبار میں سرمائے کا جو کردار ہوتا ہے وہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا کردار نہیں ہوتا، جس کا مطلب ہے کسی شے کا اپنے وجود کو پوری طرح قائم و برقرار رکھتے ہوئے اپنے اختیار سے کسی دوسری شے کے وجود کا سبب اور موجب بننا، اور ظاہر ہے کہ یہ بات ایک مردہ و بے جان اور بے شعور و بے اختیار سرمائے میں نہیں ہوتی بلکہ ہو ہی نہیں سکتی، وہ تو اپنی ماہیت میں صرف ایک قدرتی مادہ اور انسانی محنت کے مفید اثرات کا مرکب ہے اور یہ دونوں چیزیں اللہ کے اور انسان کے اختیار و ارادے سے وجود میں آئیں اپنے اختیار و ارادہ سے نہیں چنانچہ جب کوئی سرمایہ کاروبار میں استعمال ہوتا ہے تو استعمال سے بے اختیار تحلیل ہوتا جاتا ہے لیکن تحلیل ہونے سے وہ معدوم اور ضائع نہیں ہوجاتا بلکہ اس کے ساتھ انسانی محنت کے جو مفید اثرات تھے وہ نئی محنت کے اثرات میں منتقل ہوجاتے اور ان کی جو قدر و قیمت تھی وہ اس نئی قیمتی شے کی قدر و قیمت میں شامل ہوجاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کوئی کاروبار کرنے اور منافع کمانے کے لئے سرمائے کا وجود ضروری ہوتا ہے اور یہ کہ سرمائے کے بغیر کوئی کاروبار نہیں ہوسکتا لیکن کسی چیز کے لئے ضروری ہونا اور بات ہے اور کسی چیز کا کسی چیز کو پیدا کرنا اور بات، دونوں میں تلازم نہیں یعنی ایک کے لئے دوسری کا ہونا لازم نہیں، میں سمجھتا ہوں شاید اسی سے دھوکا و مغالطہ کھا کر سرمائے کو محنت کی طرح عاملِ پیداوار مان لیا گیا ہے، دراصل پیداوار میں سرمائے کا جو حصہ ہوتا ہے وہ صرف اتنا ہوتا ہے جتنا کہ تحلیل ہونے سے سرمائے کی قدر و قیمت میں کمی واقع ہوئی ہوتی ہے۔ لہٰذا سرمائے کا مالک پیداوار میں سے اتنے حصّے کا ضرور حقدار ہوتا ہے جو کاروبار میں استعمال سے اس کے سرمائے میں سے کم ہوا، اس سے زیادہ کا نہیں، مثلاً سرمائے کی قدر و قیمت میں ایک سو روپے کی کمی ہوئی تو پیداوار کی مجموعی قدر و قیمت میں سے ایک سو روپیہ سرمایہ کا حصہ ہوتے اور باقی سب محنت کا حصہ ہوتا جس کا حقدار محنت کش قرار پاتا ہے۔

اپنے اس تیسرے اعتراض میں جناب محمد اکرم خان صاحب کا یہ فرمانا کہ اگر صرف محنت کو منافع کا سبب قرار دیا جائے تو اس سے اجرتوں کا مروّجہ ڈھانچہ غلط قرار پاتا ہے۔ نیز بعض ایسے معاملات کا حرام ہونا لازم آتا ہے جن کے جواز پر امت کا اتفاق رہا ہے...... الخ پہلی بات کا جواب یہ کہ محنتوں کی اجرتوں کا مروّجہ ڈھانچہ نظام سرمایہ داری کے نزدیک صحیح ہو تو ہو جو ہمارے ہاں ایک عرصے سے رائج ہے لیکن اسلامی معاشی نظام کی رو سے درست نہیں جو قرآن و حدیث اور کتاب و سنت میں تو ہے لیکن صدیوں سے کسی مسلم معاشرے میں رائج اور نافذ نہیں بلکہ ناسمجھی سے ہم سرمایہ دارانہ معاشی نظام کو ہی اسلامی معاشی نظام باور کررہے ہیں۔ اعتراض کے دوسرے حصہ میں اگر بعض معاملات سے مراد مضاربت کا معاملہ ہے جس میں بظاہر ایک فریق محض اپنے سرمائے کی بنا پر بغیر کسی دماغی جسمانی محنت کے نفع کے ایک حصہ کا مستحق قرار پاتا ہے تو اس کا جواب یہ کہ مضاربت کا جواز اس وجہ

سے نہیں کہ تجارت میں حاصل ہونے والا نفع، محنت اور سرمائے دونوں سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا نفع کی صورت میں سرمایہ والا فریق نفع کا جو حصہ لیتا ہے اس کا وہ جائز حقدار ہوتا ہے، بلکہ اس کا جواز اس وجہ سے ہے کہ اس میں بصورت نقصان وخسارہ سرمائے والا فریق پورا نقصان وخسارہ خود برداشت کرتا ہے اور چونکہ یہ ایک فقہی قاعدہ ہے کہ جو شخص کسی چیز کا نقصان برداشت کرتا ہے وہ اس کا فائدہ بھی اٹھا سکتا ہے لہٰذا اس قاعدے کی رو سے معاملۂ مضاربت میں رب المال کے لئے نفع کے ایک حصہ کا لینا جائز ہو جاتا ہے لیکن یہ جواز اپنی حیثیت میں ایسا نہیں ہوتا جیسا کہ اپنے سرمائے کے ساتھ خود محنت کر کے کمائے ہوئے نفع کا جواز ہوتا ہے، اور یہ اس لئے بھی کہ قاعدہ مذکور یہاں حقیقی اور کلی طور پر منطبق نہیں ہوتا کیونکہ ایسا بہت کم کبھی ہوتا ہے کہ مضاربت میں مال والے فریق کو نقصان پہنچتا ہو۔ ورنہ عموماً نفع ہی پہنچتا ہے۔ بہرحال یہ حقیقت ہے کہ مضاربت میں سرمائے والا نفع کا جو حصہ لیتا ہے وہ اس سود جیسا نہیں ہوتا جو سودی معاملے میں سود خور لیتا ہے، لیکن اس نفع جیسا بھی نہیں ہوتا جو ایک تاجر اپنے سرمائے کے ساتھ خود محنت ومشقت کر کے کماتا ہے۔ لہٰذا اس کی حیثیت بین بین اور مشتبہ ہوتی ہے گویا جائز بمعنی مکروہ ہوتا ہے جائز بمعنے واجب اور مستحب نہیں ہوتا، غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید کی کسی آیت اور کتب حدیث کی کسی صحیح مرفوع روایت میں مضاربت کے متعلق کوئی ترغیبی ہدایت اور حکم نہیں، علامہ ابن حزم وغیرہ نے لکھا ہے کہ ہر فقہی باب کے لئے قرآن وحدیث سے دلیل مل سکتی ہے سوائے باب مضاربت کے کہ اس کے لئے نہیں مل سکتی، اور یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر کبھی کسی کو مضاربت پر مال نہیں دیا، نبوت سے پہلے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ جو معاملہ ہوا تھا روایات کے الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مضاربت کا معاملہ نہ تھا بلکہ متعین اجرت پر اجارے کا معاملہ تھا۔ دو جوان اونٹ طے ہوئے تھے علاوہ ازیں مضاربت میں کام کرنے والے فریق کی حیثیت ایک اجیر اور مزدور کی ہوتی اور وہ نفع میں سے جو لیتا ہے اس کی حیثیت کام کی اجرت کی سی ہوتی ہے جس کے جواز میں کوئی شک وشبہ نہیں کیونکہ قرآن وحدیث کی صریح نصوص سے اس کا جواز ثابت ہے، مطلب یہ کہ مضاربت میں کام کرنے والے فریق کے لحاظ سے کسی درجہ میں کوئی حرج اور کراہت نہیں اگر کوئی حرج اور کراہت ہے تو صرف رب المال کے لحاظ سے۔ کیونکہ وہ ایسی اجرت پر دوسرے سے کام کراتا ہے جو کو نسبتی حصہ کے لحاظ سے متعین سہی لیکن مقدار کے لحاظ سے غیر متعین اور مجہول ہوتی اور یقینی کی بجائے غیر یقینی اور احتمالی ہوتی ہے اور یہ چیز اجارے کے معاملے کو اگر باطل نہیں تو فاسد اور مکروہ ضرور بنا دیتی ہے، اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اندر بھی مضاربت کا عام رواج نہیں۔ رہا اکا دکا کچھ مثالیں ملتی ہیں وہ بھی اپنے مال کو مضاربت پر دینے کی نہیں بلکہ زیر نگرانی یتیموں کے مال کو مضاربت پر دینے کی، جس کا مطلب یہ کہ ابتدا میں یہ معاملہ بعض معذور قسم کے لوگوں تک محدود تھا۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق جو روایت ہے کہ وہ اپنا مال مضاربت پر دیتے تھے سند کے لحاظ سے محدثین کے نزدیک ضعیف اور ناقابل اعتماد روایت ہے اور اگر اس کو صحیح بھی مان لیا جائے تو ہو سکتا ہے یہ اس وقت کی بات ہو جب تحریم ربوٰ کا اعلان نہیں ہوا تھا اور حضرت عباسؓ ربوٰ تک کا معاملہ کرتے تھے یہاں تک کہ خطبہ حجۃ الوداع میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نام لے کر اپنے چچا عباسؓ کی ربوٰ کے منسوخ اور ختم کرنے کا اعلان فرمایا، واضح رہے کہ مضاربت کی شرعی حیثیت پر میرا ایک مفصل مقالہ ہے جس میں مضاربت سے متعلق تمام دلائل پر شرح وبسط کے ساتھ بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ معاملہ ربوٰ کی طرح حرام نہیں بلکہ جائز ہے لیکن کراہیت کے ساتھ، اور یہ کہ اس کے جواز کی وجہ یہ نہیں کہ سرمایہ بھی محنت کو پیدا کرتا ہے بلکہ وہ ہے جو اوپر عرض کی گئی، بنا بریں سرمائے کے عامل پیدا کار

ہونے کی نفی اور صرف محنت کے حامل پیداوار ہونے کے اثبات سے مضاربت کی قسم کے معاملات کا حرام ہونا لازم نہیں آتا۔

جناب محمد اکرم صاحب کا اعتراض چہارم ایک بدیہی حقیقت پر اعتراض ہے سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر مقصد کیا ہے؟ بتلائیے کس ہوشمند کو اس بات سے انکار ہو سکتا ہے کہ مزارعت اور بٹائی پر دوسرے کی زمین وہی کاشتکار کرتا ہے جس کے پاس حسب ضرورت اپنی زمین نہیں ہوتی کیونکہ اپنی زمین کاشت کرنے سے اسے پوری پیداوار ملتی اور دوسرے کی زمین مزارعت پر کاشت کرنے سے پیداوار کا ایک حصہ ملتا ہے اور ظاہر ہے کہ کوئی انسان بھی پوری کے مقابلہ میں اس کے ایک حصہ کو خوشی کے ساتھ قبول نہیں کرتا بلکہ مجبوری کے تحت اختیار کرتا ہے، یہ ایک مسلمہ عملی حقیقت ہے جس کا ہم روزمرہ کی زندگی میں برابر مشاہدہ کرتے ہیں، من گھڑت فرضی مثالوں سے جو عمل کی دنیا میں کہیں موجود نہیں اس بدیہی بات کا انکار کرنا اور اسے منطقی موشگافیوں کا نشانہ بنانا ایک عجیب اور حیرت انگیز بات ہے اور جو کسی طرح شان حق پرستی سے جوڑ نہیں کھاتی۔

آخر میں میں جناب محمد اکرم خان صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے کچھ اشکالات اور اعتراضات پیش کر کے مجھے موقع دیا کہ میں بعض اہم مسائل پر اپنے خیالات عرض کروں جو اسلامی معاشی نظام میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں اور جن کی توضیح و تعیین کے بغیر اسلامی معاشی نظام واضح اور متعین نہیں ہو سکتا۔ خاتمے پر یہ دعا ہے کہ

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اتِّبَاعَہٗ وَاَرِنَا الْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ!

بقیہ: سائنس کا روحانی پہلو

ہی نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ عام انسانی فضائل کا روحانی فضائل سے رشتہ جوڑ کر قرآن حکیم نے Value Integration اور Value synthesis کا ایک ایسا عظیم الشان کارنامہ انجام دیا ہے جس کے لئے دور حاضر کے انسان کو قرآن حکیم کا خاص طور پر احسان مند ہونا چاہیئے۔ یہ ہماری کس قدر بدقسمتی ہے کہ مظاہر فطرت کے حسی مشاہدات کو روحانی تجربہ میں ڈھال دینے کی اس قرآنی قوت پر ابھی تک بہت ہی کم توجہ دی گئی ہے اگرچہ اس میں بھی شک نہیں کہ مسلمانوں کے تہذیبی لاشعور میں یہ بات کسی نہ کسی شکل میں ہمیشہ موجود رہی اور اس کی صدائے بازگشت عصر حاضر کے مفکرین کے افکار میں آج بھی سنی جا سکتی ہے۔ اس سلسلے میں پاکستان میں ڈاکٹر اقبال اور ڈاکٹر رفیع الدین، ایران میں ڈاکٹر حسین نصر اور ڈاکٹر علی شریعتی اور الجیریا میں ڈاکٹر عبدالمجید میزبانے نے اپنے اپنے انداز میں اسلامی ثقافت کی جامعیت اور ہمہ گیری پر زور دیتے ہوئے طبیعی علوم کا رشتہ روحانیت سے از سر نو جوڑنے پر اصرار کیا اور اس طرح سے اسلام کے اس کردار کی طرف اشارہ کیا ہے جو اسے عصر حاضر میں لازماً ادا کرنا چاہیئے۔

امام حمید الدین فراہیؒ

کے تفکر و تدبر قرآن کا مرقع

مجموعہ تفاسیر فراہیؒ

اعلیٰ دبیز کاغذ پر بڑے سائز (۲۲×۲۹/۸) کے ۵۳۶ صفحات

عمدہ آفسٹ کی طباعت اور سنہری ڈائی والی مضبوط اور دیدہ زیب جلد کے ساتھ

ہدیہ صرف -/۶۰ روپے (علاوہ محصول ڈاک)

اب رجب المرجب تک طلب فرمانے والے حضرات کو
مولانا فراہیؒ کی دو مزید تصانیف: 'اقسام القرآن'
اور 'ذبیح کون ہے؟' مفت ارسال کی جائیں گی۔

نوٹ: وی پی ارسال نہیں کیا جائے گا۔ خواہشمند حضرات -/۷۰ روپے
بذریعہ منی آرڈر ارسال کریں۔ کتاب بذریعہ رجسٹرڈ بک پوسٹ ارسال کردی جائیگی

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن، ۳۶ ماڈل ٹاؤن، لاہور

افکار و آراء

ایک فکر انگیز مکتوب۔۔۔۔

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

کئی دنوں سے آپ کو خط لکھنے کی کوشش کر رہا تھا لیکن ہجوم کار نے اس کی فرصت نہ دی۔ آپ کی ادارت میں شائع ہونے والے جرائد "میثاق" اور "حکمتِ قرآن" پابندی سے مطالعہ سے گزر رہے ہیں، ان دونوں جریدوں کے مضامین و مقالات اپنی مقصدیت وافادیت کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ خاص طور پر "محاضراتِ قرآنی" کے ذیل میں پڑھے جانے والے مقالات کی اشاعت وقت کی اہم ضرورت ہے۔

جنوری ۱۹۸۶ء کے شمارہ میں ڈاکٹر غلام محمد کا مقالہ "قرآنی نگاہ میں تاریخ کا مقام" دعوتِ فکر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ فرمانا بجا ہے کہ:

"عقلاً تاریخ میں قطعیت اور صداقتِ کاملہ کی صفت نہ تو پائی جا سکتی ہے۔ نہ قرآن ہی اس کو "دینی حجت" کے درجہ میں قبول کرتا ہے۔"

لیکن ساتھ ہی وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

"تاریخ سے بے التفاتی کے سبب ہمارے لائق فخر علمائے کرام خصوصاً مفسرینِ عظام سے بعض ضمنی و ذیلی ہی نوعیت کی سہی، تاریخی اور جغرافیائی غلطیاں جو تفاسیر وتصانیف میں درج ہو گئی ہیں ان کو پڑھ کر اہلِ استشراق کو خندہ زنی کا موقع ملتا اور نہ ان تسامحات کو طشت ازبام کر کے وہ ہمارے علماء کی ساری کاوشِ علمی کو عام مسلمانوں خصوصاً انگریزی تعلیم یافتگان کی نگاہ میں بے وقعت و ناقابلِ التفات ٹھہرا سکتے۔"

جنابِ والا! اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہمارے جن علمائے عظام کی تفاسیر وتصانیف میں جو تاریخی اور جغرافیائی غلطیاں رواج پا گئی ہیں اور جنہیں پڑھ کر اہلِ استشراق کو خندہ زنی کا موقع ہاتھ آتا ہے اس سے نجات کس طرح حاصل ہو؟ کیا شخصیت پرستی کی انتہا پسندانہ روش سے مغلوب وہ علمائے کرام اس بات پر آمادہ ہو سکیں گے کہ ان کے قابلِ فخر اور لائقِ احترام بزرگوں کی تصانیف میں سے "تاریخی اور جغرافیائی غلطیوں" کو "قلم زد" کیا جائے؟ علامہ محمد امین المصری مرحوم نے اپنی کتاب "فجر الاسلام" میں نہایت مدلل طریقے پر مذکورہ علمائے کرام و مفسرینِ عظام کی تصانیف وتفاسیر میں ان غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اس ضمن میں سب سے خطرناک وہ گروہ علماء ہے جو بڑی "عقیدت" سے تاریخی نوعیت کے واقعات کو قرآنی احکامات اور احادیث سے "گڈمڈ" کرتا ہے۔ جس کا واضح ثبوت واقعاتِ "جمل و صفین" اور "حادثۂ کربلا"[1] ہے۔ اگر ہم ان

---

[1] الحمد للہ اس موضوع پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دو تالیفات "شہیدِ مظلوم" اور "سانحۂ کربلا" موجود ہیں۔ (ادارہ)

واقعات کو خالص قرآنی نقطۂ نظر سے دیکھتے ہیں تو بات کچھ اور بنتی ہے اور اگر تاریخی حقائق کی روشنی میں دیکھتے ہیں تو کچھ اور ہی شکل نظر آتی ہے۔ بھوڑی دیر کے لئے آپ "مولویوں" کو نظر انداز کر دیں اور ان کی جگہ اس دور کے سب سے "روشن خیال" اور "فہم قرآن" کے دعویدار یعنی سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب ہی کو لیجئے۔ ایک جانب تو وہ یہ فرماتے ہیں کہ فلاں حدیث حکم قرآن سے مطابقت نہیں رکھتی اس لئے قابلِ قبول نہیں اور دوسری جانب اپنی تصنیف "خلافت و ملوکیت" میں ان ضعیف و مجہول تاریخی روایات کو قبول کرتے چلے جاتے ہیں جو متفقہ طور پر "کارخانۂ رفض" کی ایجاد ہیں۔ ایسی صورت میں اگر شیخ الحدیث استاذ العلماء حضرت مولانا اسحاق ندوی سندیلوی اپنی تصنیف "اظہار حقیقت بجواب خلافت و ملوکیت" میں مودودی صاحب کی کتاب سے پیدا ہونے والے شکوک و شبہات کی نشاندہی فرماتے ہیں تو قاضی مظہر حسین چکوالی انہیں "خارجی و ناصبی" کے خطابات مرحمت فرماتے ہیں۔

جناب محترم! یہ بات اپنی جگہ درست کہ تاریخ کو "دینی حجت" کا درجہ نہیں دیا جا سکتا لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلّمہ ہے کہ ہم "تاریخ" کو بالکل مسترد بھی نہیں کر سکتے! لہٰذا المیۂ فکر یہ یہ ہے کہ اسلامی تاریخ کے جن واقعات پر شکوک و شبہات کا پردہ پڑا ہوا ہے۔ اسے کس طرح "چاک" کیا جائے؟ تو اس کی پہلی صورت یہ ہے کہ قرآن و حدیث کے فرامین کو تاریخی واقعات سے اس طرح علیحدہ کیا جائے کہ یہ واقعات نہ تو اپنی حقیقت و صداقت سے عاری ہوں اور نہ انہیں قرآن و حدیث کا درجہ دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ تاریخ اسلام کی از سرِ نو تدوین کی جائے کیونکہ یہ وقت کا اہم ترین تقاضا ہے۔

اس شمارہ میں محترمی مولانا سعید الرحمٰن علوی کا مضمون "عقیدہ محفوظیتِ قرآن" بڑا قیمتی ہے۔ میرے ناقص خیال میں مولانا کی بصیرت اس مقام پر پہنچ چکی ہے جہاں سے "دنیائے رفض و باطنیت" کا ہر گوشہ "عریاں" نظر آتا ہے۔ فی الوقت خمینی کے نام نہاد اسلام کی جادوگری جس طرح عامۃ المسلمین خصوصاً نوجوان نسل کے ذہنوں کو مسخر کر رہی ہے اس کے "توڑ" کے لئے اسی جرأتِ رندانہ کی ضرورت ہے جو اللہ تعالیٰ نے مولانا سعید الرحمٰن علوی کو عطا فرمائی ہے۔ پھر آپ کے دینی جذبہ کی داد ہی نہیں دی جا سکتی کہ آپ جملہ خطرات کو نظر انداز کرتے ہوئے ایسے موضوعات پر مضامین و مقالات شائع فرما رہے ہیں۔

جناب والا! آپ سے ایک درخواست یہ بھی ہے کہ "میثاق" اور "حکمتِ قرآن" میں اس عہد کے سب سے بڑے اسلامی فلسفی جناب ڈاکٹر برہان احمد فاروقی مدظلہ العالی کے افاداتِ عالیہ" کو بھی پابندی سے جگہ دیں۔ ایسی نابغہ ہستیاں روز روز پیدا نہیں ہوتیں۔

○

(نوٹ) پروفیسر یوسف سلیم چشتی اس خاموشی سے رخصت ہو گئے کہ خبر نہ ہوئی۔ مقام عبرت ہے کہ "بھانڈوں" اور "مراثیوں" کی موت پر ہفتوں "شہ سرخیوں کے ساتھ خبریں شائع کرنے اور ان کے سوگ میں اداریے لکھنے والے قومی اخبارات ایک عالم، محقق اور علم دوست انسان کی وفات پر "سونٹھ کی ناس" لے کر بیٹھ گئے۔

آپ کا نیاز مند،
سلیم فاروقی، کراچی

سانحہ

ڈاکٹرا

اہم تقریر جواب

ات ——

ت : ——

Regn. L. No. 8192

HIKMAT-E-QURAN MONTHLY LAHORE

Vol. 3 | MARCH 1984 | No. 1

قارئین حکمتِ قرآن مطلع رہیں کہ

اِنشاءاللہ العزیز

مرکزی انجمن خدّام القرآن ○ لاہور

کے زیرِاہتمام

پانچویں بار

محاضراتِ قرآنی

مورخہ ۲۵ مارچ تا ۲۸ مارچ ۸۴ء ○ بمقام : جناح ہال

میں منعقد ہونگے جن میں مقامی اصحابِ علم و دانش کے علاوہ ہندوستان سے

بھی علماء کرام شرکت فرمائیں گے

صلائے عام ہے یارانِ نکتہ داں کے لیے